صفا



دار العلوم سبیل السلام حیدرآباد

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کا علمی، دینی، ادبی سہ ماہی رسالہ

صفا

○ شمارہ: ۸

○ جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب ۱۴۱۰ھ

○ مطابق:

○ جنوری، فروری، مارچ ۱۹۹۰ء

مدیر اعلیٰ: محمد رضوان القاسمی

مدیر: خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر: شعبۂ نشر واشاعت، دارالعلوم سبیل السلام

پوسٹ بالاپور حیدرآباد ۵۰۰۰۰۵ انڈیا

فون: ۲۳۹۳۵۰

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افتتاحیہ

ہندوستان میں مسلمان اس وقت ایک ایسی نازک صورتِ حال سے گذر رہے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں ایسی ابتلاء کا وقت کم ہی آیا ہوگا، فرقہ وارانہ فسادات کی لہر ہے، بابری مسجد کے مسئلہ نے ایک آتش فشاں کی صورت اختیار کر رکھی ہے اور ہندوؤں کا ایک انتہا پسند طبقہ بے دلیل اور بلا ثبوت اس موضوع پر اتنا جھوٹ بول رہا ہے کہ وہ "سچ" بن جائے، وہ نہ تاریخ پڑھنے کو تیار ہے، نہ عدالت کا فیصلہ ماننے پر راضی ہے، نہ اس کے پاس خود اپنے دعوی کے لئے کوئی تاریخی دستاویزی شہادت ہے ——— یہ دراصل محض ایک سازش نہیں، بلکہ سازشوں کا عنوان ہے، مسلمانوں کی تاریخ اور اس ملک کے لئے مسلمانوں کی قربانی کو تاریخ سے حرفِ غلط کی طرح مٹانے کی سعی کی جارہی ہے اور ان کے عہدِ اقتدار کو اس طرح پیش کیا جارہا ہے کہ ہندوؤں کی نسل میں ان کے خلاف نفرت اور مسلمانوں کی نئی نسل میں احساسِ کمتری پیدا ہو جائے، ان کے شخصی قوانین پر اعتراض کا سلسلہ اور اس کے خلاف مہم بھی جاری رہے۔ مساجد کو بت کدوں میں تبدیل کرنے کی ایک وسیع اور منظم سازش بھی ہے، جو چنگاری سے آتش فشاں بن چکی ہے۔

اردو زبان کے خلاف [illegible] پرست ادیبوں کا ایک غول کمر بستہ ہے، حتّٰی کہ ہندوستان کے عہدِ اوّل کے آخری [illegible] سلطان ٹیپو شہید کی زندگی پر ایک ٹی وی سیریل اس کے حقیقی اور شرعی حسن و قبح [illegible] نقطۂ نظر سے اس لئے نہیں دیکھائی جاسکی ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

[illegible] جو سیاسی تبدیلی آئی ہے، شبہ نہیں کہ وہ خوشگوار اور خوش آئند ہے اور ایک اقلیت [illegible] ت ہونے کے باوجود ایمانداری کے ساتھ وہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے

کے لئے کوشاں ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ فرقہ پرستی کا جو تخم تناور درخت بن چکا ہے اور بعض سیاسی جماعتوں نے جس کو سیراب و آبیاری کر کے بچپن سے جوان کیا ہے اس کو اکھاڑ پھینکنا آسان نہیں ہے، اس کے لئے بڑے پیمانہ پر کام کرنا ہوگا، پولیس اور سرکاری عہدیداروں میں ایسے عناصر کا پتہ لگانا ہوگا، نصاب کی کتابوں پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور ایسے مضامین کو نکالنا ہوگا جو حقائق پر مبنی نہیں ہیں اور جو انگریزی عہد میں وضع کئے گئے افسانے ہیں، دلوں میں انقلاب لانا ہوگا، مذہبی اور روحانی اقدار کو اجاگر کرنا ہوگا، فرقہ وارانہ سیاست پر قدغن عائد کرنی ہوگی۔ حالات اب اتنے دور جا چکے ہیں کہ ان وسیع الاثر اور دور رس کاموں کے لئے ایک زمانہ مطلوب ہوگا اور بڑی جد وجہد اور فراست کی ضرورت ہوگی، خدا کرے کہ موجودہ وزیر اعظم جناب وی، پی سنگھ جو اپنی معاملہ فہمی میں شہرت رکھتے ہیں، اس سمت میں نمایاں کام کر سکیں۔

پنجاب کا مسئلہ ہی ملک کے لئے کم پیچیدہ نہیں تھا کہ اب کشمیر کے مسئلہ نے بھی سر اٹھایا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس سرحدی ریاست میں آگ لگانے میں بھی بیرونی عناصر کا ہاتھ ہے اور سرحد پار سے تخریب پسندوں کی مدد کی جا رہی ہے۔ ممکن ہے کہ اس میں صداقت ہو، تاہم یہ تو ایک حقیقت ہے کہ کشمیری عوام کے ساتھ گذشتہ چالیس سالوں سے مسلسل حق تلفی ہوتی آرہی ہے اس ریاست کے لئے فلاحی اور معاشی کام بہت کم کیا گیا اور اس کی ترقی و بہبود کی طرف بہت کم توجہ کی گئی چنانچہ اس بے توجہی نے ریاستی عوام میں علیحدگی کے احساس کو اور ہوا دی اور اس سے ان لوگوں نے فائدہ اٹھایا، جن کو ہندوستان کے ساتھ کشمیر کا الحاق پسند نہ تھا، اب اس احساس کو دبانے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جا رہا ہے اور طاقت کا استعمال ہو رہا ہے، اندیشہ ہے کہ اس سے مسائل سلجھنے کے بجائے اور الجھ کر رہ جائیں گے اور نفرت کی دیوار اور مضبوط ہوتی چلی جائے گی کشمیر میں اس وقت جس بات کی ضرورت ہے وہ یہی کہ وزیر اعظم کے بقول "اہل کشمیر کے زخم پر مرہم لگایا جائے" ——— کاش، ارباب اقتدار اس مسئلہ پر صحیح ڈھنگ سے غور کریں اور حقیقت پسندی سے کام لیں۔

۱۹۸۹ء کا سال گذر چکا، دنیا کی تاریخ میں یہ ایک تاریخی اور انقلابی سال کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا، ایسا سال جس میں "اشتراکیت" کے تجربہ کی ناکامی کا خود اشتراکی ممالک کو اعلان کرنا پڑا، کمیونسٹ بلاک میں آئے دن جمہوریت کی بحالی کی جو خبریں سنی جا رہی تھیں اور دھوم دھام سے اشتراکی نظام کا جنازہ اٹھ رہا تھا، اب یہ طوفان خود روس میں بھی آ پہونچا ہے، اقتدار سے کمیونسٹ پارٹی کی اجارہ داری ختم ہو رہی ہے، کثیر جماعتی نظام کو پھر سے وجود بخشا جا رہا ہے، ملک کی مختلف ریاستیں ہیں، جو آزادی کی انگڑائیاں لینے کی کوشش کر رہی ہیں، روس کی مسلم ریاستوں میں آزادی کی ایک نئی لہر جنم لے رہی ہے اور یہ اسلام کا اعجاز اور اس کی غیر معمولی قوتِ تسخیر ہی ہے کہ اس طویل جبر و استبداد، مذہب مخالف اور خصوصیت سے اسلام مخالف منصوبہ بند مساعی، تشدد اور ہر طرح کی پابندی کے باوجود اس ملک میں بھی مسلمانوں نے اپنا وجود باقی رکھا اور اسلام سے ان کا رشتہ ٹوٹنے نہ پایا ——— ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حالات میں روسی مسلمان اور مسلم ممالک وقت کے تقاضوں کو سمجھیں اور حکمت و دور اندیشی کے ساتھ اس تبدیلی سے فائدہ اٹھائیں اور اس کو اسلام کی دعوت و فروغ کا ذریعہ بنائیں، کہ تاریخ میں یہ انقلابات بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان اوقات میں معمولی سی بے تدبیری غیر معمولی اور دیرپا نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔

اس شمارہ کے ساتھ "صفا" کی دوسری جلد مکمل ہو گئی، "صفا" نے اپنی کم سنی کے باوجود اہلِ ذوق کے درمیان جو مقام بنایا ہے، اس پر خدا کے حضور جبینِ سپاس خم ہے، اس موقع پر خصوصیت کے ساتھ ہم اہل علم کے مشوروں کے محتاج ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ کی قیمتی آراء سے استفادہ کرتے ہوئے ہم مستقبل کی تعمیر کریں، آئندہ شمارہ یعنی تیسری جلد سے ہم مضامین کے بعض نئے سلسلوں کا آغاز کرنا چاہتے ہیں، جن میں ایک اہم سلسلۂ مضمون "اسلام کے خلاف مستشرقین اور دوسرے معاندین کی طرف سے اٹھائے جانے والے اعتراض کے عالمانہ اور تحقیقی جواب" کا ہوگا، یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے اور حالات کا تقاضا ہے کہ اس طرح کے

موضوعات پر زیادہ سے زیادہ لکھا جائے اور گہرے اور وسیع مطالعہ کے ساتھ لکھا جائے قارئین دعا کریں کہ "صفا" کے خدام کے یہ عزائم پورے ہوں اور خدا کی مدد ان کے شریکِ حال ہو۔

دینی مدارس میں "نصاب تعلیم" کا مسئلہ ایک اہم ترین مسئلہ ہے اور فکر و پرداخت اور تعلیم سے اس کا گہرا تعلق ہے، یہ ایک نازک مسئلہ بھی ہے، اسلئے کہ ہندوستان میں علماء اور دینی مدارس اس قضیہ میں بہت حساس واقع ہوئے ہیں، اس سے انکار حقیقت ناشناسی ہوگی، کہ درس گاہی تنگ نظری نے بھی اس مسئلہ کو بحث و نظر کا میدان بنا دیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ وسیع المشربی اور عالی ظرفی کے ساتھ اس اہم مسئلہ پر غور کیا جائے، قدیم کتب کو محض اسلئے کم قابلِ اعتناء نہ سمجھا جائے کہ وہ "قدیم" ہیں، گو نافعیت میں ان کا بدل موجود نہ ہو اور جدید مرتب شدہ نصابی کتابوں کو صرف اسلئے رد نہ کر دیا جائے کہ "یہ سلف مرحومین" کی تالیف نہیں ہے، کیونکہ اسلامی علوم پر جو بھی کتاب ہوگی اور جس دور میں بھی لکھی جائے گی وہ بہرحال سلف صالحین کے ہی افادات سے ماخوذ ہوگی، محض اس کا "پیرہن" بدلا ہوا ہوگا۔ علوم عصریہ کو اتنی اہمیت نہ دیدی جائے کہ وہ ان علوم میں ناپختگی کا باعث بن جائیں، جو اصل مقصود دین اور ایسا بھی نہ ہو کہ ان علوم سے اس درجہ تغافل، بلکہ اعراض و انحراف ہو کہ گویا یہ "شجر ممنوعہ" ہیں اور نتیجہ یہ ہو کہ ان مدارس سے نکلنے والے طلبہ میدانِ عمل میں اترنے کے بعد اجنبیت کا احساس کریں۔

اسی مقصد کے پیشِ نظر دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد نے اس ماہ نصاب تعلیم پر غور و خوض کے لئے ملک و بیرون ملک کے ماہرین تعلیم اور تجربہ کار اساتذہ و مدرسین سے آراء طلب کی ہیں اور ان کو سامنے رکھ کر اپنا ایک "نصاب" مقرر کیا ہے، جو امید ہے کہ ایک معتدل، متوازن مفید اور جامع نصاب ثابت ہوگا، آئندہ شمارہ میں انشاء اللہ اس کی تفصیلات سے قارئین واقف ہو سکیں گے۔ دعا ہے کہ خدا تعالیٰ اس سفر کو بامرام و کامیاب فرمائے۔

"صفا" کے زیرِ نظر شمارہ میں بھی ہم نے قارئین کی ضیافتِ فکر و نظر کے لئے پوری سعی کی ہے، قرآنیات میں ایک اہم اور دلچسپ تحریر کتب تفسیر کے جائزہ سے متعلق ہے جس میں اردو اور عربی کی اکثر اہم تفسیروں کا تعارف آگیا ہے، ان کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے اور کتابوں کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ان کی خامیوں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ فقہ اسلامی کے تحت اس شمارہ میں کسی نئے مضمون کے بجائے فقہی سمینار منعقدہ دہلی ۹ تا ۱۱ر دسمبر ۱۹۸۹ء کی تجاویز شریکِ اشاعت ہیں، شخصیات میں مشہور فقیہ و محدث علامہ عینی پر ایک جامع اور وقیع تحریر آپ کے مطالعہ میں آئے گی، ادبیات میں "امجد حیدرآبادی کی رباعی" پر آپ پڑھیں گے، امجد حیدرآبادی اردو میں اسلامی افکار و اقدار کی ترجمانی میں ایک بلند پایہ مقام کے حامل ہیں اور کم شعراء ہیں جو اس باب میں ان کے ہم قامت ہیں۔ اس مقالہ کے ذریعہ امید ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ ہو سکے گا۔ یہ دراصل وہ مقالہ ہے، جس کو راقم سطور نے "رابطۂ ادب اسلامی" کے سمینار منعقدہ حیدرآباد۔ "تحریک آزادی اور اصلاحِ عوام میں ادبِ اسلامی کا حصہ (۹ر اکتوبر ۱۹۸۹ء) روز دوشنبہ میں پڑھا تھا۔ تصوف کے موضوع پر اب تک "صفا" میں کچھ نہیں آیا تھا، اس شمارہ میں اس موضوع پر ایک اہم مقالہ "اسلام کا روحانی نظام" کے نام سے شریکِ اشاعت ہے، یہ تحریر مشہور صاحبِ علم و اہلِ قلم مولانا غلام محمد صاحب (پاکستان) خلیفہ علامہ سید سلیمان ندوی کی ہے، گویا خود میکدۂ تصوف کے ایک قدح خوار نے اہلِ ذوق کو اس کی لذت سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ یہ تحریر بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی ــــ افسوس کہ فقہیات میں ایک اہم مضمون جو "کفاءت" کے مسئلہ سے متعلق تھا صفحات کی تنگ دامانی کے باعث شریکِ اشاعت نہ ہو سکا امید کہ آئندہ شمارہ میں آپ ان سے استفادہ کر سکیں گے۔

محمد رضوان القاسمی

۲۷ر رجب ۱۴۱۰ھ

تفسیر قرآن کی کتابوں پر ایک طائرانہ نظر

چھ سات سال قبل جب دار العلوم سبیل السلام میں جلالین شریف تک کی تعلیم ہوتی تھی استاذ محترم مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی نے اس مدرسہ اور بعض دوسرے مدارس کے طلبہ کے سامنے مذکورہ بالا عنوان کے تحت "محاضرہ" دیا تھا، یہ وہی محاضرہ ہے، جو معمولی ترمیم کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے، اب جب کہ یہ "صفا" میں طبع ہو رہا ہے، مولانا نے "تفسیر ماجدی" پر ایک نوٹ کا اضافہ کردیا ہے اور علوم قرآن کا حصہ حذف کردیا گیا ——— محمد عابد ندوی ———

طلبۂ عزیز! "قرآن کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوں گے" ——— حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ تفسیر اور علوم قرآن کی اکثر کتابوں میں موجود ہے اور تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے، ہر حیثیت ہر طریق اور ہر اعتبار سے قرآن مجید پر جو کام ہوا ہے، دنیا کی کسی مذہبی یا غیر مذہبی کتاب پر اس کا دسواں حصہ بھی کام نہیں ہوا ہوگا، کوئی مورخ اس سلسلے میں ایسی خدمات کا احاطہ کرلے، یہ مشکل ہے۔ تاہم آج کی مجلس میں چاہتا ہوں کہ اختصار کے ساتھ ان مشہور، بڑی اور اہم علمی خدمات کا تعارف کراتا چلوں جو قرآن مجید کے مختلف علمی اور فنی گوشوں سے متعلق ہیں، گو کہ یہ اس موضوع پر کوئی احاطہ نہیں ہوگا تاہم کاروانِ علم و تحقیق اور رہروانِ شوق کے لئے نشانِ راہ کا کام ضرور دے گا۔

مبسوط تفسیریں

اس کا آغاز ہم قرآن مجید کی ان تاریخی تفسیروں سے کریں گے، جو شرح وبسط اور تفصیل و اطناب کے اعتبار سے ممتاز و معروف ہیں، افسوس کہ ان میں سے بعض موجود ہیں اور بعض وہ ہیں کہ صرف ان کے نام تاریخ کے صحائف میں رہ گئے ہیں اور وہ اس وقت ناپید ہیں، یا مخطوطوں کی صورت میں کہیں موجود ہیں، خدا کرے جلد وہ زیورِ طبع سے آراستہ ہو جائیں اور اہلِ ذوق کی چشمِ طلب کا سرمہ بنیں۔ چنانچہ:

۱۔ قاسم بن قطلوبغا حنفی نے "تاج التراجم" میں نقل کیا ہے کہ عبد الرحمن بخاری حنفی (م ۵۴۶ھ) جو صاحبِ ہدایہ کے استاذ بھی ہیں، نے ایک تفسیر لکھی تھی جو ہزار اجزاء سے بھی زیادہ پر مشتمل تھی۔

۲۔ کشف الظنون کے بیان کے مطابق شیخ ابویوسف عبد السلام محمد قزوینی (م ۴۸۳ھ) نے بعض اقوال کے مطابق ۵۰۰ اور بعض اقوال کے مطابق ۳۰۰ جلدوں پر مشتمل تفسیر "حدائق ذات بہجۃ" کے نام سے لکھی تھی، علامہ زاہد الکوثری نے دوسری رائے کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ بغداد پر مغلوں کے تسلط کے دوران یہ کتاب ضائع ہوگئی۔

۳۔ علامہ زاہد الکوثری نے اپنے مقالات میں لکھا ہے کہ ابن شاہین نے ایک تفسیر ایک ہزار حصوں میں لکھی ہے اور ابن عربی نے ۸۰ ہزار اوراق پر مشتمل تفسیر "انوار الفجر" کے نام سے لکھی تھی، جو اب نایاب ہے۔

۴۔ مولانا یوسف بنوری نے "یتیمۃ البیان فی علوم القرآن" میں نقل کیا ہے کہ ابوالحیان اندلسی کے اساتذہ میں سے کسی کی تفسیر ۱۰۰ جلدوں پر مشتمل ہے، جس کے بعض اجزاء استنبول کے آثارِ قدیمہ میں محفوظ ہیں۔

۵۔ "کشف الظنون" میں ہے کہ شیخ جمال الدین ابوعبداللہ حنفی مقدسی (م ۶۹۸ھ) کی تفسیر قرآن مجید "التحریر والتحبیر لاقوال ائمۃ التفسیر فی معانی کلام السمیع البصیر" پچاس جلدوں سے زیادہ پر مشتمل ہے۔

۶۔ مولانا یوسف بنوریؒ نے لکھا ہے کہ شیخ ابوالقاسم اصبہانی (م ۵۲۵ھ) اور شمس الدین ابوالمظفر (م ۴۶۵ھ) کی تفسیر ۳۰ جلدوں پر مشتمل ہے۔

۷۔ نیز امام ابوالحسن اشعری نے "مختزن" کے نام سے ۷۰ جلدوں میں ایک تفسیر لکھی ہے۔

۸۔ اور قاضی عبد الجبار الہمدانی نے ۱۰۰ حصوں میں "المحیط" نام کی تفسیر تصنیف کی ہے۔

۹۔ ابن ندیم نے لکھا ہے کہ تیسری صدی کے ایک بزرگ مفضل بن سلمہ حنفی کی تفسیر "ضیاء القلوب فی معانی القرآن" ۲۰ جلدوں سے زیادہ پر مشتمل ہے۔

۱۰۔ مشہور مصری عالم اور صاحبِ قلم "احمد امین نے" ظہر الاسلام" میں لکھا ہے کہ محمود بن سبکتگین کی نگرانی میں علماء کی مدد سے ۱۰۰ جلدوں میں ایک تفسیر مرتب ہوئی۔

۱۱۔ اور ابو جعفر نحاس کے شاگرد ابوبکر اوخوی کی کتاب علوم القرآن ۱۲۰ جلدوں میں تھی۔

ابھی جو سب سے ضخیم تفسیر موجود ہے وہ "فتح المنان" ہے، جو "تفسیر علامی" کے نام سے مشہور ہے، یہ ۴۰ جلدوں پر مشتمل ہے، اس کے بعض اجزا مصر کے کتب خانہ "دار الکتب" میں اور بعض ترکی کے مکتبہ استنبول میں موجود ہیں۔

مختصر تفسیریں

جہاں ایک طرف اتنی ضخیم اور مبسوط تفسیریں لکھی گئی ہیں، وہیں دوسری طرف قرآن مجید کی نہایت مختصر تفسیریں بھی مرتب ہوئیں، اس سلسلے میں تین تفسیریں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ "جلالین" یہ سورہ بقرہ سے ختم سورہ بنی اسرائیل تک جلال الدین سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) اور سورۂ کہف سے سورۂ ناس تک علاوہ فاتحہ کے جلال الدین محلی (م ۸۶۴ھ) کے قلم سے ہے، جو سیوطی کے استاذ بھی ہیں۔ یہ تفسیر اختصار کے باوجود اپنی جامعیت اور اعتدال و توازن کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے، مشکل الفاظ کی تشریح، نحوی ترکیب، صرفی تعلیل اور دفع شبہات پر خصوصی توجہ دی گئی ہے، البتہ تکرار بہت ہے، کہیں کہیں ضعیف روایات بھی ذکر کر دیتے ہیں۔

مصنف کی نظر حدیث پر بھی ہے، مگر حیرت ہے کہ اس کے باوجود انہوں نے محض ایک ضعیف روایت کی بنا پر، جو از روئے روایت بھی ضعیف ہے اور از روئے درایت بھی، لکھ دیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب "سورۃ والنجم" کی آیت "افرئیتم اللات والعزیٰ ومناۃ الثالثۃ الاخریٰ" پڑھی تو شیطان نے آپؐ کی زبان پر "تلک الغرانیق العلی وان شفاعتھن لترتجیٰ" کے الفاظ جاری کرا دیے اور بعد کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی۔ سیوطی جیسے شخص کا اس طرح کی باتیں نقل کرنا حیرت انگیز ہے۔

۲۔ "مدارک" اس کا پورا نام "مدارک التنزیل وحقائق التاویل" ہے، اس کے مصنف عبداللہ بن احمد نسفی (م ۷۰ھ) ہیں۔ یہ جلالین کے مقابل مفصل ہے، اس میں نحو اور صرف کی ترکیب سے زیادہ قرآن کے مقاصد کی تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ مصنف متصلب حنفی ہیں، صاحب کشف الظنون نے اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ تفسیر کی ایک متوسط کتاب ہے، جس میں اعراب و قرأت کی مختلف وجوہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، بدیع و بیان کے نکات بھی بتائے گئے ہیں، اہل سنّت والجماعت کے اقوال نقل کئے گئے ہیں اور اہلِ بدعت و گمراہ فرقوں کی خرافات سے خالی ہے۔ نہ اتنی طویل ہے کہ تھکا دے اور نہ اتنی مختصر کہ سمجھنے میں مخل ہو۔"

۳۔ تیسری تفسیر "تفسیر خازن" ہے، جس کا اصل نام "لباب التاویل فی معانی التنزیل" ہے، مصنف کا نام علاء الدین علی بن محمد بن ابراہیم بغدادی ہے، جو "خازن" سے مشہور ہیں۔ یہ کتاب دراصل محی السنۃ ظہیر الدین بغوی کی "معالم التنزیل" کی تلخیص ہے۔ اور خود مصنف کے بقول سوائے نقل و انتخاب اور سند و روایت حذف کرنے کے انہوں نے اس میں اپنی طرف سے کوئی تصرف نہیں کیا ہے۔

کتاب کے شروع میں "علوم القرآن" پر ایک مختصر اور جامع مقدمہ بھی ہے، جس میں قرآن کے فضائل، تفسیر بالرائے پر وعید، قرآن مجید کی جمع و تدوین اور اس کے سات حروف پر نازل ہونے کی توضیح اور تفسیر و تاویل کی فنی تعریف وغیرہ مباحث ہیں۔ پوری کتاب تین جلدوں میں ہے۔ مختصر تفسیروں میں یہ نسبتاً زیادہ مفصل ہے، اور بلاغت و اعتقاد کے مباحث کے علاوہ آیات سے متعلق احادیث بھی کثرت سے نقل کی ہیں، صرفی اور نحوی تراکیب بھی خاص طور پر مصنف کے پیشِ نظر ہیں۔

کلامی اور اعتقادی

ان تفسیروں میں جن میں کلامی مباحث زیادہ ہیں اور اعتقادات پر زور دیا گیا ہے تین تفسیریں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ "مفاتیح الغیب" جو "تفسیر کبیر" کے نام سے مشہور ہے، اس کے مصنف امام فخر الدین رازی شافعی (م ۶۰۶ھ) ہیں۔ میرے دیکھنے میں اس تفسیر کا جو نسخہ آیا ہے وہ آٹھ ضخیم جلدوں میں ہے، جلال الدین سیوطیؒ نے "الاتقان" میں اس تفسیر پر تنقید نقل کی ہے کہ اس میں "تفسیر" کے سوا اور سب کچھ ہے، لیکن مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ اس سے متفق نہیں ہیں، بلکہ اس تفسیر کے بہت مداح ہیں، اور خصوصیت سے "مشکلات قرآن" کے حل میں ان کے بہت ثنا خواں ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ امام رازی ہر مسئلہ پر تشفی بخش گفتگو کرتے ہیں، مثلاً انہوں نے

صرف "فحشاء" اور "کبائر" کے فرق پر صفحہ ۶۱، تا ۷۹، تک لکھا ہے، اپنے معاصر فلسفیانہ نقاط نظر پر گہری بصیرت رکھتے ہوئے کلام کرتے ہیں، فنی بحثوں میں بھی ان کی تعبیر ممکن حد تک واضح اور سلیس ہوتی ہے۔

۲۔ اس سلسلہ کی دوسری عظیم الشان تفسیر "کشاف" ہے، جس کے مصنف جار اللہ زمخشری (م ھ) ہیں یہ مسلکاً معتزلی ہیں اور اہل سنت والجماعت پر شدید تنقید کرتے ہیں اور اکثر مقامات پر مسلمانوں کے ایک مشہور تاریخی فرقہ "معتزلہ"[1] کی تائید میں شمشیر برہنہ نظر آتے ہیں، ماضی سے آج تک جو بھی تجدد پسند مفسرین گذرے ہیں اور انہوں نے روایات کے بجائے خالص عقلی رنگ میں قرآن کی تفسیر کرنے کی کوشش کی ہے، ان کو اس تفسیر سے خاصی غذا ملی ہے۔

اس تفسیر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ مصنف نے عربیت و بلاغت پر بڑا زور دیا ہے، اس لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے۔ صاحب مصباح نے اس تفسیر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی: لم یصنف مثلہ۔

۳۔ تیسری تفسیر "بیضاوی" ہے، جو درس نظامی کے اکثر مدارس میں داخل نصاب ہے، اس میں کلامی اور اعتقادی مباحث "مفاتیح الغیب" سے لی گئی ہیں۔ عربیت و بلاغت میں "کشاف" سے استفادہ کیا گیا ہے اور لطائف و نکات امام راغب اصفہانی کی "مفردات القرآن" سے لئے گئے ہیں۔ نواب صدیق حسن خاں نے "الاکسیر فی اصول التفسیر" میں اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مصنف نے تمام رطب و یابس کو جمع کر دیا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ اس تفسیر میں متقدمین جیسی شگفتگی بیان و سلاست نہیں ہے، اور تعبیر نہایت ژولیدہ ہے اور شاید اس تفسیر پر یہ بات صادق آتی ہے کہ اس میں تفسیر قرآن کم اور دوسرے علوم زیادہ ہیں۔

---

(۱) معتزلہ ایک فرقہ تھا، جو اسلامی معتقدات کی خالص عقلی توجیہہ کرتا تھا، کسی ماورائے عقل بات کو شریعت میں جگہ دینے کو تیار نہ تھا، معجزات کا قائل نہ تھا، گناہ کبیرہ کے مرتکب کو خارج از اسلام باور کرتا تھا خبر واحد کی حجیت کا قائل نہ تھا اور تعدد ازدواج کا منکر تھا۔

فصاحت وبلاغت

فصاحت وبلاغت اور زبان کے لحاظ سے ابھی ذکر کیا گیا ہے کہ کشاف ایک بے نظیر تفسیر ہے، اس کے علاوہ دو اور تفسیریں ہیں، جو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

۱۔ ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم :-

یہ سلطنت عثمانیہ ترکی کے مفتی شیخ ابوالسعود حنفی (م ۹۵۱ھ) کی تفسیر ہے، (۱۳) ، ۱۰ اجزء کو اس تفسیر کے دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہے، تاہم متاخرین کی اکثر کتب تفسیر میں اس کا ذکر اور حوالہ ملتا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مولانا محمد یوسف بنوری جیسے عالم اور محدث نے اس کو بعض اعتبار سے "کشاف" پر فوقیت دی ہے۔

۲۔ فی ظلال القرآن :

یہ تفسیر سید قطب شہید کی ہے، اور اپنی زبان کی سحر آفرینی اور اثر انگیزی اور قوت وشیرینی کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہے اور اس کا حرف حرف مصنف کے اسلام سے عشق ووالہانہ تعلق اور روئے زمین پر اس کے غلبہ واظہار کے بے تابانہ شوق ووارفتگی کا نشان ہے، اس میں آیاتِ قرآنی کے ربط اور زبان پر خصوصی توجہ دی گئی ہے اور مناظر اس طرح کھینچے گئے ہیں، گویا کہ نظروں کے سامنے ہوں اور آیاتِ قرآنی کی معاصر حالات پر تطبیق بھی کی گئی ہے۔

بعض مقامات پر بڑی اچھی تفسیر ہے، مثلاً حروفِ مقطعات کے بارے میں ان کی رائے ہے کہ اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ قرآن انہیں حروف سے مرکب ہے، جن سے عام انسانی کلام کی ترکیب ہوتی ہے، پھر بھی انسان ان کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے، یہ حال نہ صرف کلام کا ہے بلکہ تمام اشیاء کا ہے کہ انسان جب مٹی، چونا، لوہا وغیرہ کو ملا کر ترکیب دیتا ہے تو محض ایک "بے جان بُت" بنتا ہے اور خدا انہیں اشیاء کو ترتیب دے کر "زندہ انسان" کو وجود بخشتا ہے ——— اسی طرح "علم آدم الاسماء" اور مختلف آیات کی بڑی عمدہ تفسیر کی ہے۔

ربط ونظم

قرآن مجید کے ربط ونظم پر بھی مختلف کتابیں لکھی گئی ہیں، گو کہ خود اس میں بھی اختلاف ہے

کہ قرآن مجید ایک "مربوط کلام" ہے یا نہیں، اکثر علماء سلف وخلف اس کو ایک مربوط اور مرتب کلام تسلیم کرتے ہیں، اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں چار کتابیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱۔ "نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور":

یہ اس کتاب کا معروف اور اصل نام ہے، لیکن مصنف کا خیال ہے کہ اس کے لئے "فتح الرحمٰن فی تناسب اجزاء القرآن" کا نام بھی مناسب ہوتا، اور اس سے زیادہ بہتر نام "ترجمان القرآن ومبادی مناسبات القرآن" ہوتا، مصنف کا نام ابوالحسن شافعی (م ۸۸۵ھ) ہے، یہ تفسیر نہایت عمدہ، محققانہ، اور اپنے موضوع پر بصیرت افروز ہے، بعض جگہ بڑے نادر نکات آگئے ہیں، مصنف کا ماخذ ابوالحسن حرالی کی "مفتاح الباب المقفل لفہم القرآن المنزل" ہے، اس کی ضخامت کا تناسب یہ ہے کہ صرف سورہ بقرہ کی تفسیر ۴۹۹ صفحات پر ہے، اس کتاب کے بعض اجزاء ماضی قریب میں "دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد" سے شائع ہوئے ہیں اور بقیہ زیر طبع ہیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ اس کتاب کا محرک مصنف کا ایک خواب ہے، جس کا خود مصنف نے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔

۲۔ "نظام القرآن وتاویل الفرقان":

یہ قرآنیات کے مشہور عالم مولانا محمد حمید الدین فراہی کی ہے، وہ قرآن مجید کی آیات میں گہرے ربط وتعلق کے قائل تھے اور قرآن کی مختلف سورتوں اور ان کے مختلف حصوں کو علیحدہ علیحدہ گروپ میں تقسیم کرتے ہیں۔ قرآن کی خود قرآنی آیات سے تفسیر پر زور دیتے ہیں، ترتیب اور ربط پر بحث کرتے ہیں، ضعیف روایات سے احتراز کرتے ہیں اور قرآن مجید میں جو آیات یا احکام مکرر آئے ہیں ان کی وجوہ پر روشنی ڈالتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں کہ محض ظاہری تکرار ہے، ورنہ اس کا مختلف جگہ وارد ہونا مختلف الگ الگ مقاصد کے لئے ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی مبسوط تفسیر "تدبر قرآن" میں مولانا فراہی کے تصورات اور تشریحی نکات بڑی کثرت اور عمدگی کے ساتھ لکھے ہیں۔

۳۔ "سبق الغایات فی نسق الآیات":

یہ تقریباً ۱۰۵ صفحات پر مولانا اشرف علی تھانوی (م ھ) کا رسالہ ہے، جو "قلّ ودلّ" ہے اور بیان القرآن کے حاشیہ پر موجود ہے، اس میں عموماً ابوالسعود حنفی کی "ارشاد السلیم" اور

امام رازی کی تفسیر سے استفادہ کیا گیا ہے۔

۴۔ اس سلسلہ کی ایک اہم کتاب "فی ظلال القرآن" ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

تصوف

بعض حضرات نے صوفیانہ نقطۂ نظر سے بھی قرآن مجید کی تفسیر کی ہے، جو واقعہ یہ ہے کہ تفسیر بالرائے کا صحیح نمونہ ہے اور اگر اس قسم کی تشریح سے اغماض برتا جائے تو باطنیہ اور ملحدین کی من چاہی تفسیروں کو رد کر دینے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ افسوس کہ بعض علماء نے اس معاملے میں ایک گونہ پہلوتہی سے کام لیا ہے، اس پر تبصرہ کے لئے ایک کتاب درکار ہے۔ لیکن اس کا اندازہ ان تفسیری نمونوں سے بھی ہو جائے گا، جسے میں آگے ذکر کروں گا۔ اس سلسلہ میں دو تفسیریں خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی "تفسیر القرآن":

قرآن کی ایک آیت میں حضرت زکریاؑ کو حضرت یحییٰؑ کی بشارت دیے جانے کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

"اللہ تعالیٰ آپ کو ایک لڑکے کی خوش خبری دیتے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہے۔ آپ کے لئے اس کی نشانی یہ ہے کہ آپ لوگوں سے گفتگو نہیں کریں گے، اے یحییٰؑ! کتاب لو۔"

ابن عربی اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

يبشرك بغلام (القلب) اسمه يحيي بحياته ابدا..... آيتك ان لا تكلم الناس (الحواس) بالتراغل الحسية والمخالطة بالامور الطبعية) يا يحيي (القلب) خذ الكتاب اى كتاب العلم المسمى بالعقل الفوقاني۔

. . . . . .

. . . . . .

اللہ تعالیٰ تجھ کو ایک لڑکے (دل) کی خوش خبری دے رہے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہے (اس لئے کہ دل ہمیشہ زندہ رہتا ہے)، آپکے لئے نشانی یہ ہے کہ آپ لوگوں سے گفتگو نہ کریں گے۔ (لوگ سے مراد حواس ہے، یعنی حسی مشاغل میں مصروف نہ ہوں گے اور طبعی امور کے اختلاط سے بچیں گے) اے یحییٰ (دل) کتاب لو، یعنی علم کی کتاب جس کا نام "عقل فوقانی" ہے۔

قرآن مجید نے سورۂ نصر میں کہا ہے: اذا جاء نصر اللہ والفتح کہ جب اللہ کی مدد آجائے اور فتح حاصل ہو جائے۔ مگر ابن عربی کو اس میں جو نکات مل گئے وہ حسب ذیل ہیں:

اذا جاء نصر الله المدد الملکوتی والتایید القدسی بتجلیات الاسماء والصفات والفتح المطلق للذی لا فتح وراءہٗ وھو فتح باب الحضرۃ الاحدیۃ والکشف الذاتی بعد الفتح المبین فی مقام الروح بالمشاھدۃ۔

جب اللہ کی مدد آجائے (یعنی صفات و اسماء باری تعالےٰ کے ذریعہ ملکوتی مدد اور قدسی تائید) اور فتح (یعنی وہ فتح مطلق جس کے بعد کوئی فتح نہیں، یعنی بارگاہِ احدیت کا دروازہ کھلنا اور فتح کے بعد ذاتِ باری کا مقامِ روح میں مشاہدہ کے ذریعہ کشف

۲۔ تقریباً اسی قسم کی عجیب و غریب تفسیر علاؤ الدین علی بن احمد مہائمیؒ (۷۷۶۔۸۳۵ھ) کی "تبصیر الرحمٰن وتیسیر المنان بعض مایشیر الیہ اعجاز القرآن" ہے، جو دو جلدوں میں ہے۔ میری نظر سے جو نسخہ گذرا ہے، اس کے صفحات ۸۴۲ ہیں، اس میں بھی زیادہ تر ابن عربی ہی سے استفادہ کیا گیا ہے، ربط، لغوی تشریح، سورتوں کے وجوہِ تسمیہ اور تعارف پر بھی کلام ہے، اکثر مقامات پر لاطائل تاویلات تفسیریں ہیں، مثلاً: کٓھٰیٰعٓصٓ میں مختلف حروف کی تشریح اس طرح کرتے ہیں:

کبیر ھبۃ ید عزۃ صاعدۃ

یا ـــــ کافی ھدایہ یقین عالی صافی

شیخ اکرام اللہ نے "آب کوثر" میں اس تفسیر سے متعلق حضرت مجدد الف ثانیؒ کا قول نقل کیا ہے:

"مصنف ایں کتاب خیلے میل بہ مذہب فلاسفہ دارد ونزدیک است کہ حکیماں را عدیل انبیاء سازد"۔

اس کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مذہب کی طرف بہت میلان رکھتا ہے اور قریب ہے کہ فلاسفہ کو انبیاء کا درجہ دیدے۔

عنایت اللہ وزیر آبادی کی تفسیر "آیات للسائلین" بھی اسی رنگ کی ہے، البتہ اس موضوع پر مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مختصر رسالہ "مسائل السلوک فی کلام الملوک" بہت عمدہ ہے، جس میں خواہ مخواہ معنی آفرینی کے بجائے فقہاء کے انداز پر آیاتِ قرآنی سے تصوف و احسان کے مسائل اور اس کے آداب و احکام کا استنباط کیا گیا ہے۔

مولانا کا طرز استدلال یوں ہے کہ مثلاً انبیاء کی بشریت سے استدلال کرتے ہیں کہ:

دل علی ان المناسبۃ شرط کمال الفیض — یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مکمل طور پر فیضیاب ہونے کیلئے مناسبت شرط ہے۔

اسی طرح کہیں کہیں غالی صوفیاء اور مبتدعین کے طرز فکر پر نشتر بھی چلاتے ہیں: مثلاً "کلوا من الطیبات" سے نتیجہ اخذ تے ہیں:

فیہ ابطال الرھبانیۃ ابتدعھا النصاری۔ اس میں اس رہبانیت کا ابطال ہے، جو نصاری نے گھڑ رکھا ہے۔

یہ مختصر کتاب "بیان القرآن" کے حاشیہ پر مطبوعہ ہے۔

فقہی احکام

قرآن مجید کی کوئی تفسیر بھی فقہی احکام سے مستغنی نہیں ہو سکتی، اسلئے کہ قرآنی آیات کا ایک قابلِ لحاظ حصہ فقہی احکام و قوانین پر مشتمل ہے، تاہم بعض تفسیریں ہیں، جن پر فقہی رنگ غالب ہے، ان میں دو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں:

۱۔ "الجامع لاحکام القرآن":

یہ امام ابو عبداللہ قرطبی (م ۶۷۱ھ) کی تفسیر ہے جس کی زبان نہایت عام فہم اور سلیس ہے، احادیث و آثار اور مفسرین کے اقوال نقل کرنے کا کافی اہتمام ہے، تفسیر بہت مرتب ہے، ہر آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھ دیتے ہیں کہ اس میں اتنے مباحث ہیں، ہر لفظ اور فقرہ پر تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ مثلاً "آمین" پر ۸ صفحات "نفقہ" پر ۳ صفحات لکھے گئے ہیں۔ "اقیموا الصلوٰۃ" کی تفسیر صفحہ ۳۴۳ تا ۳۵۱ ہے اور اس میں ۸ مباحث ذکر کئے گئے ہیں، ائمہ اربعہ اور دیگر فقہاء محدثین کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں، اور خود مسلکاً مالکی ہیں۔

۲۔ "تفسیر مظہری":

یہ مولانا قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی (م ۱۲۲۵ھ) کی تفسیر ہے، جو ان کے شیخ مظہر جان جاناںؒ کے نام سے موسوم ہے، دس ضخیم جلدوں میں ہے، فقہی احکام پر بہت تفصیل سے لکھا گیا ہے، احادیث و آثار بھی کثرت سے نقل کی گئی ہیں، فقہی ذوق غالب ہے۔

کتاب میں فقہ حنفی کی بھرپور توجیہ کی گئی ہے، جابجا ضروری نحوی اور صرفی مباحث بھی لکھ دئے گئے ہیں، حل لغات کا بھی اہتمام ہے، واقعات و قصص میں مصنف ضعیف روایات اور اسرائیلیات

بھی کثرت سے نقل کرتے ہیں، تاہم بعض مواقع پر روایت کے ضعف واستناد پر کلام بھی کرجاتے ہیں۔

تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن

تفسیر قرآن کے مآخذ میں سب سے پہلا، سب سے مستند اور سب سے اہم مآخذ خود قرآن مجید ہے، اکثر مفسرین نے اس کا خیال رکھا ہے، علماء ہند میں مولانا فراہی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس معاملہ میں خاص ملکہ تھا لیکن مولانا ثناء اللہ امرتسری کو شاید اس میں اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے پورے قرآن مجید کی تفسیر خود آیاتِ قرآنی سے کرنے کا التزام کیا، ان کی اس تفسیر کا نام "تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن" ہے جو ۵۰۷ صفحات پر مشتمل ہے، مولانا نے حاشیہ پر تفسیری احادیث نقل کی ہیں، جس میں صحیح روایات کے انتخاب کا خاص خیال رکھا گیا ہے، عام مفسرین کی طرح ضعیف روایات قبول نہیں کی ہیں۔ اور ایسی روایات پر تنقید بھی کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

اما محمد بن اسحاق والواقدی والکلبی وماذکروا تحت کل آیة من قصة فاکثرہ غیر صحیح عند المحدثین (ص ۵)

محمد بن اسحاق واقدی اور کلبی نے ہر آیت کے تحت جو قصے ذکر کئے ہیں، ان میں سے اکثر محدثین کے نزدیک صحیح نہیں ہیں۔

. . . .

اس التزام کی وجہ سے اکثر مقامات پر تفسیر بہت مبہم اور غیر واضح ہوگئی ہے۔ مثلاً:

ثلثة قروء ای اطہار لقولہ تعالیٰ لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین۔

تین قروء، یعنی تین طہر، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ ان لوگوں کی زبان، جن کی طرف یہ اشارہ کر رہے ہیں، عجمی ہے، اور یہ واضح عربی زبان ہے۔

یہاں مصنف کہنا یہ چاہتے ہیں کہ "قروء" سے مراد حیض نہیں ہے، طہر ہے اور دلیل یہ ہے کہ قرآن عربی زبان اور قواعد کے مطابق ہے اور زبان وقاعدہ کا تقاضا یہی ہے کہ قروء سے طہر مراد ہو۔ کیونکہ "ثلاثة" کا معدود مذکر ہونا چاہیے اور طہر بہ مقابلہ حیض کے مذکر ہے۔

تفسیر بالحدیث

قرآن کے بعد تفسیر کا سب سے بڑا ماخذ "حدیث نبویؐ" ہے، یوں تو کوئی بھی

تفسیر حدیث سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتی، لیکن بعض تفسیریں ہیں، جن میں اس بات کی سعی کی گئی ہے کہ تفسیر میں زیادہ سے زیادہ احادیث سے مدد لی جائے اور متعلقہ روایات جمع کر دی جائیں۔ میرے خیال میں تین تفسیریں اس سلسلہ میں خصوصیت سے امتیاز کی حامل ہیں:

۱۔ "تفسیر جامع البیان"

یہ تفسیر ابن جریر طبری (م: ۳۱۰ھ) کی ہے، بعد کے مفسرین نے اس کتاب سے بڑی مدد لی ہے، اس میں بڑی کثرت سے احادیث نقل کی گئی ہیں، مثلاً وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا کی تفسیر میں ۱۲، اور وھو الذی خلق السموٰت والارض فی ستۃ ایام میں ۲۰ احادیث ذکر کی گئی ہیں۔

۲۔ "تفسیر القرآن":

اس کے مصنف عماد الدین بن کثیر شافعی (م ۷۷۴ھ) ہیں، جو ابن تیمیہ کے شاگرد ہونے کے باوجود معتدل ہیں، ابن کثیر کی تفسیر بعض وجوہ سے طبری کی تفسیر پر بھی فوقیت رکھتی ہے، اسلئے کہ ابن کثیرؒ اکثر مقامات پر ضعیف روایات پر نقد بھی کرتے ہیں، لیکن مفسرین اور صوفیاء کے عام مزاج کے مطابق کہیں اسرائیلیات اور غیر صحیح روایات ذکر کر کے کسی تنقید کے بغیر بھی گزر جاتے ہیں، فقہی مسائل میں بڑے شد و مد سے فقہ شافعی کی تائید کرتے ہیں، مگر کہیں کہیں از راہِ انصاف ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو دوسرے دبستانِ فقہ کی تائید میں ہوتی ہیں، مثلاً: اذا قرء القرآن فاستمعوا لہ وانصتوا کے سلسلے میں بعض ایسی روایات کو تسلیم کرتے ہیں، جو احناف کی تائید میں ہیں۔

مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ نے تفسیر ابن کثیر کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر کوئی کتاب کسی کتاب سے بے نیاز کر سکتی ہے تو ابن کثیر تفسیر طبری سے مستغنی کر دیتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے، اس لئے کہ ابن کثیرؒ نے طبری سے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور اس کا عطر اور نچوڑ لے لیا ہے۔

۳۔ "الدر المنثور فی التفسیر بالماثور":

یہ حافظ جلال الدین سیوطی (م ۹۱۱ھ) کی تفسیر ہے۔ یہ مسلکاً شافعی ہیں۔ اور علوم حدیث پر گہری نظر رکھتے ہیں، اسلئے روایت میں اول الذکر دونوں مصنف سے زیادہ محتاط ہیں، خود مجھے بھی تفسیر بالحدیث کے لحاظ سے یہی تفسیر زیادہ پسند ہے اور اکثر اسی سے رجوع کرتا ہوں، البتہ فقہی مسلک میں بہت تصلب رکھتے ہیں۔

سائنس وطبیعیات

یہ دور چونکہ سائنس اور طبیعیات کا ہے، اسلئے عربی اور اردو میں مختلف اہلِ قلم نے اس نقطۂ نظر سے بھی قرآن کی تفسیر کی ہے، ایسی کتابوں میں سب سے ممتاز اور مشہور علامہ طنطاوی کی "جواہر القرآن" ہے، جو ۳۰ جلدوں میں ہے۔ تاہم اس کے حسن وقبح پر کافی کلام کی گنجائش ہے اس تفسیر کی سب سے بنیادی کمزوری یہ ہے کہ قرآن کی سائنسی علوم پر اس طرح تطبیق دینے اور سائنسی اور طبیعیاتی مسائل کا استخراج کرنے کی سعی کی گئی ہے کہ گویا قرآن کا مقصود ہدایت دینا نہیں، بلکہ لوگوں کو سائنس کی تعلیم دینا ہے۔ دوسرے اکثر مقامات پر غیر متعلق بحثیں کی گئی ہیں، مثلاً زمین کا ذکر کیا گیا تو اس سے متعلق تمام سائنسی حقائق لکھ دیئے گئے، حالانکہ قرآن نے وہاں ان بحثوں سے کوئی تعرض ہی نہیں کیا ہے۔

چند اہم تفسیریں

اب ہم چند ایسی جدید وقدیم تفسیروں کا ذکر کرتے ہیں، جو ہمہ جہت نوعیت کی ہیں اور بڑی مفصل ہیں۔

۱۔ "البحر المحیط":

مصنف کا نام محمد بن یوسف اندلسی (۶۵۴ - ۷۴۵ھ) ہے اور ابو حیان کے نام سے مشہور ہیں، تفسیر بڑی مبسوط، شافی اور عمدہ ہے، مثلاً صرف لفظ "خشیۃ" کی ڈیڑھ صفحات میں تشریح کی گئی ہے لفظی تحقیق اور نحوی تراکیب پر خاص توجہ دی گئی ہے، مثلاً لفظ یہود، نصاریٰ اور لفظ ذالک ہی کا آپ مطالعہ کرلیں ——— مصنف نے "النہر المعیط" کے نام سے اور تاج الدین حنفی (۶۸۲ - ۷۴۹ھ) نے "الدر اللقیط" کے نام سے اس کی تلخیص بھی کی ہے۔

۲۔ "روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی":

یہ شہاب الدین آلوسی (م ۱۲۷۰ھ) کی تفسیر ہے، ۳۰ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، نہایت جامع، تشفی بخش، مفصل اور مفید تفسیر ہے، حدیث وفقہ، نحو وصرف، ادب وبلاغت اور کلام واعتقاد، ہر حیثیت سے قرآن مجید کی ایک مکمل تفسیر ہے اور اپنی مثال آپ ہے۔

مختلف علماء کے اقوال نقل کرنے کا اہتمام کرتے ہیں اور پھر خود محققانہ محاکمہ کرتے ہیں، تنقید بھی بڑی چبھتی ہوئی ہوتی ہے، جس میں حسن بھی ہوتا ہے، مثلاً کہیں کہتے ہیں: "ھٰذا قول حسن وھو لیس بحسن" "ھٰذا رای منصور، وھو فیہ غیر منصور" "کذا قال مالک بن دینار وکیف قال وما یقول کذا مالک درہم"۔ متصلب حنفی ہیں اور فقہی مسائل پر خاص توجہ دیتے ہیں۔

اس تفسیر میں بڑی خوبیاں ہیں، لیکن ایک خامی ہے، جو اکثر متصوف مفسرین کے ساتھ لگی رہتی ہیں اور وہ یہ کہ "من باب الاشارات" کے عنوان سے وہ صوفیاء کے مذاق کے وہ خاص "الہامات" بھی نقل کرتے جاتے ہیں، جو ابن عربی وغیرہ کے رنگ کے ہوتے ہیں۔ دوسرے فقہی مسائل میں مخالفین کے معاملہ میں ان کا لب ولہجہ بہت سخت ہو جاتا ہے، رشید رضا مصری نے ان کی اس کمزوریوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے: "یری بعینی التقلید العمیاوین (وہ تقلید کی اندھی آنکھوں سے دیکھتے ہیں) کاش! یہ تفسیر ان کمزوریوں سے خالی ہوتی۔

۳۔ "فتح البیان فی مقاصد القرآن":

یہ نواب صدیق حسن خاں کی فاضلانہ تفسیر ہے، اس میں زیادہ تر قاضی شوکانی کی تفسیر "فتح القدیر" ، در حافظ سیوطی کی "در منثور" سے استفادہ کیا گیا ہے، ضعیف روایات، مفسرین کے ضعیف اقوال اور اسرائیلیات پر تنقید کی گئی ہے، فقہی مسائل میں سلفی مکتبۂ فکر کی بھرپور ترجمانی ہے، تفسیر بحیثیت مجموعی عمدہ ہے۔

خود مصنف کو اپنی کتاب کے بارے میں بڑا حسنِ ظن ہے، فرماتے ہیں:

فان کنت ممن یرید الصعود علی معارج التحقیق والقعود فی محراب التدقیق فعلیك بذالك التفسیر جامعاً للروایۃ والدرایۃ واستنباط الاحکام۔ (نیل المرام، ص ۳)

اگر تم تحقیق کے زینوں پر چڑھنا اور علم و فن کی محراب میں بیٹھنا چاہتے ہو تو تم کو اس تفسیر سے استفادہ کرنا چاہیے، جو روایت و درایت اور احکامِ فقہیہ کے استنباط کو جامع ہے۔

۴۔ "المنار":

یہ مصر کے مشہور عالم مفتی محمد عبدہ کے افادات ہیں، جسے ان کے تلمیذ رشید علامہ رشید رضا نے اپنے بیش قیمت اضافہ اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے، موجودہ دور میں لکھی گئی اردو اور عربی تفسیروں میں

غالباً یہ سب سے بہتر کتاب ہے۔ مصنف چونکہ جدید و قدیم ہر دو علوم پر دستگاہ رکھتے ہیں، اسلئے مغربی شبہات کا بھی شافی رد کرتے ہیں، فقہی اور علمی مسائل پر غیر جانبداری اور مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ لکھتے ہیں۔

"اعجاز قرآن" پر ۴۵ صفحات (۱۹۱ - ۲۳۵) میں بڑی نفیس بحث کی ہے اور اس میں ایک عنوان "المسائل العصریۃ التی سبقت القرآن الی بیانہا" (وہ عصری تحقیقات جن کے بتانے میں قرآن نے سبقت کی ہے) کا بھی قائم کیا ہے اور جدید سائنسی تحقیقات کا قرآن سے تقابل کرایا ہے ——— اس تفسیر میں ایک بڑی عمدہ بات یہ ہے کہ ہر سورہ کے آغاز میں اس سے متعلق ضروری اور مفید بحثیں ذکر کر دی گئی ہیں جس میں اس کے نزول کا تاریخی پس منظر، اس میں آنے والے اہم شرعی اور فقہی اصول اور بنیادی مضامین بتائے گئے ہیں، مثلاً سورہ فاتحہ کی ابتداء میں ۲، صفحات (۳۲ - ۱۰۴) کی تمہید ہے اور سورۂ بقرہ کے شروع میں ۱۶ صفحات (۱۰۵ - ۱۲۱) کی، جس میں ۳۳ اہم اصولی مسائل کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اردو کی چند اہم تفسیریں

مناسب ہے کہ اس موقع سے اردو زبان کی چند اہم اور معروف تفسیروں کا ذکر کر دیا جائے، ان میں ایسی تفسیریں بھی ہیں جو اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی صحیح ترجمان اور حزم و احتیاط کا نمونہ ہیں، اور ایسی تفسیریں بھی ہیں، جن کو "تفسیر بالرائے" کے زمرہ میں نہ رکھنا حقائق کے خلاف ہو، اور دین میں مداہنت کے مرادف ہوگا ——— اس کا آغاز میں سرسید احمد خاں کی "تفسیر القرآن" سے کرتا ہوں۔

ا۔ "تفسیر القرآن":

اس تفسیر کا پس منظر یوں ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب انگریزوں کے اقتدار کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ ہندوستان کے افق پر نمودار ہوا، تو مسلمان زعماء کے دو گروہ ہو گئے، ایک طرف وہ لوگ تھے جو اب بھی اسلام پر کامل و واثق یقین رکھتے تھے، اسلامی اقدار و افکار کے ایک شمہ سے بھی دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے اور جو کہتے تھے کہ عروج و زوال کے اس مد و جزر کا سبب اسلام اور اسلامی تہذیب نہیں، بلکہ مسلمانوں کی کوتاہ عملی اور مسلم حکومتوں کی عاقبت نااندیشی تھی، اس گروہ میں اکثر علماء تھے انھوں نے انگریزوں سے مزاحمت جاری رکھی، دینی مدارس و مکاتب کے جال بچھائے، اردو زبان میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کر دیا، جس میں عیسائیت کا رد، اسلام کی برتری اور اسلامی تعلیمات کی قانون فطرت

سے ہم آہنگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا کہ انگریزی اقتدار کی تمازت اور مغرب کی خوش نما تہذیب کی چکا چوند نے جن کی شمع فکر کو پگھلا کر رکھ دیا تھا، وہ مغرب کی سائنسی ترقی اور ان کی تہذیبی اور اخلاقی کوتاہ دامنی میں فرق نہ کر سکے اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم اسی گروہ کے سرخیل تھے، افسوس کہ وہ نہ صرف اس فکر کے حامل، بلکہ اس کے داعی اور مبلغ بن گئے اور اس کی اشاعت میں ایسے جوش اور خروش کا مظاہرہ کیا کہ گویا یہ ان کی زندگی کا بہت بڑا مشن ہو، اس مقصد کے لئے انہوں نے ایک طرف رسالہ "تہذیب الاخلاق" نکالا جس میں بہت سے مفید اخلاقی اور ادبی مضامین کے ساتھ ساتھ علماء پر لعن وطعن اور مسلمانوں کی متوارث فکر پر تنقیدیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ دوسرے اپنی تفسیر "تفسیر القرآن" لکھی جس میں ٹھیک معتزلہ اور ملاحدہ کے نقشِ قدم کی پیروی کی اور تمام معجزات کی تاویل کر ڈالی۔

سرسید کی مرعوبانہ فکر کا اندازہ ان کی اس صراحت سے ہوتا ہے:

"اسلام کی وہ حالتِ مجموعی جو تیرہ سو برس سے دنیا میں کہلایا، درحقیقت وہ اسلام نہ تھا، وہ تو علماء محمدیہ کا تراشا ہوا، یا قرآن وحدیث کے درست مطلب نہ سمجھ کر نکالا ہوا اسلام تھا، اگرچہ اس میں درست بھی تھا تو اسی قدر درست تھا، جس پر اعتراض نہ پڑتا ہو، اور جتنی باتوں پر علوم سے یا غیر اشخاص سے اعتراض واقع ہوئے ہیں، وہ سب نقصان کی باتیں ہمارے بزرگ عالموں کی غلطی سے اسلام میں قرار پکڑے ہوئے تھیں، وہ حقیقی خیالات اسلام کے نہ تھے، وہ گویا کاٹھ کی ہنڈیا تھی جو اس وقت جل رہی ہے۔"

(تہذیب الاخلاق، جمادی الاولیٰ ۱۲۹۶ھ)

سرسید صاحب نے نبوت کو وہبی کی بجائے کسبی شمار کیا، "تہذیب الاخلاق" ہی کے ایک شمارہ میں لکھ گئے:

"پھر یہ پیغمبری کسی شخص اور کسی زمانہ میں منحصر نہیں، بلکہ ہر ملک، ہر زمانہ میں ایسے لوگ جو رفارمر کہلاتے ہیں نبی ہیں، چنانچہ ہندوستان میں دیانند سرستی، اور بنگالہ میں بابو کیشب چندر سین اور انگلستان میں فلاں فلاں صاحب اب بھی نبی ہیں۔"

جنت ودوزخ کے بارے میں اپنی اسی تفسیر میں یہ رقمطراز ہیں:

"یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے، اس میں سنگ مرمر اور موتی جڑاؤ

محل ہیں، باغ میں سرسبز و شاداب درخت ہیں، دودھ و شراب و شہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی و ساقینیں نہایت خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے جو ہمارے یہاں کی گھوسنیں پہنتی ہیں شراب پلا رہی ہیں، ایک جنتی ایک حور کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑا ہے، ایک نے ران پر سر دھرا ہے، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جاں بخش کا بوسہ لیا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ، ایسا بے ہودہ پن ہے، جس پر تعجب ہوتا ہے، اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں"۔

ما بعد الطبیعی امور جو بھی قرآن مجید میں ذکر ہوئے سب کی تاویل کردی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے واقعہ میں بنی اسرائیل کے سمندر عبور کر جانے اور فرعون کے فوج سمیت غرق ہو جانے کا ذکر ہے سید صاحب نے اس کی تاویل کردی کہ بنی اسرائیل کا وقت دریا کے اتار کا تھا اور فرعون کے گذرنے کا وقت دریا کے چڑھاؤ کا، قرآن نے کہا کہ خدا نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ پتھر پر لکڑی مارو اس سے بارہ چشمے پھوٹ پڑیں گے، سید صاحب نے کہا کہ "فاضرب بعصاك الحجر" میں ضرب کے معنی چلنے کے ہیں اور مقصود یہ ہے کہ لاٹھی کی مدد سے پہاڑ پر چڑھئے تو پانی کے چشمے نظر آئیں گے۔ ملائکہ کے بارے میں کہا کہ اس سے انسان کی قوت ملکیہ مراد ہے، شیطان سے قوت بہیمیہ مراد ہے" جن" سے ایک جنگلی قوم مراد ہے، جنت و دوزخ، خوشی و غم کی کیفیات سے عبارت ہے، حوریں اور نہریں وغیرہ محض تمثیلی ہیں، یہ محض ترغیب و ترہیب کے پیرائے ہیں ——— اس طرح یہ تفسیر شروع سے آخر تک تفسیر بالرائے اور قرآن مجید میں معنوی تحریف و تصحیف کا نمونہ ہے۔ عفا اللہ عنہ۔

ترجمان القرآن

دوسری قابل ذکر تفسیر مولانا ابوالکلام آزاد کی "ترجمان القرآن" ہے، مولانا آزاد کا قلم وہ پر جوش، طاقت ور، اثر انگیز اور آتش ریز قلم ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اپنے معاصرین میں ان کو جو ذکاوت و طباعی قدرت سے عطا ہوئی تھی وہ بھی اپنی مثال آپ ہے، مولانا کی اس تفسیر میں بھی ان کی سحر نگاری اپنی آب و تاب کے ساتھ موجود ہے، سوء قسمت کہ بعض تفسیری

مسودات کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے ان کو اس تفسیر میں سلیس ترجمہ اور مختصر تشریحی نوٹس پر اکتفا کرنا پڑا ہے، بعض جگہ مبسوط حواشی بھی ہیں، یہ ترجمہ و تفسیر بنی اسرائیل تک ہے، اس کے علاوہ مولانا کے مختلف مضامین میں قرآنی آیات، ان کے ترجمے اور ضروری تشریحات آئی ہیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے "باقیات ترجمان القرآن" کے نام سے ان کو جمع کر دیا ہے۔

اس ترجمہ کے آغاز میں سورۂ فاتحہ کی مفصل تفسیر ہے، جو بہت مبسوط، بہت طویل، اور مجموعی حیثیت سے بہت عمدہ ہے اور شاید سورۂ فاتحہ کی اتنی مفصل اور کوئی تفسیر نہیں لکھی گئی ہے، اس تفسیر میں انہوں نے جو نکات اخذ کئے ہیں اور اس سورۃ کے ہر جزو پر جو عارفانہ گفتگو فرمائی ہے اور سائنسی حقائق کی روشنی میں جو خوش اسلوبی ہے، اس کو ثابت کیا ہے، وہ ایک عظیم کارنامہ ہے، مگر خود اس سورہ کی تفسیر میں انہوں نے بعض ایسی ٹھوکریں کھائی ہیں، جو ان کے معترفین کے لئے گراں خاطر ہے۔

ان کی تفسیری لغزشوں کا سب سے سنگین پہلو یہ ہے کہ ان کی بعض تحریروں سے ان کا وحدتِ ادیان کی طرف میلان معلوم ہوتا ہے۔ اھدنا الصراط المستقیم کی تفسیر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہودیت، نصرانیت اور دوسرے مذاہب کی بھی جو اصل صورت ہے صرف اس پر ایمان لے آنا ہی نجات کے لئے کافی ہے، ان کی تشریح سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ نجات کے لئے شریعتِ محمدی پر ایمان یا اس کی اتباع ضروری نہیں ہے، ایمان باللہ اور عملِ صالح مدارِ نجات ہے، اور اس کے ثبوت میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

ان الذین اٰمنوا والذین ھادوا والنصٰرٰی والصابئین من اٰمن باللہ والیوم الاٰخر وعمل صالحًا فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون ۝	مومنین، یہودی، عیسائی اور صابئین جو خدا اور آخرت پر ایمان لائے اور عملِ صالح کیا، ان کے لئے ان کے رب کے پاس اجر محفوظ ہے، نہ ان کے لئے خوف ہے اور نہ حزن و غم۔

(ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ فاتحہ ص ۳۸۲، مطبوعہ ساہتیہ اکاڈمی)

پھر عمل صالح کی انہوں نے جو تفسیر کی ہے، وہ بھی بے غبار نہیں ہے، ان کے نزدیک عبادات اور شرعی احکام اصل مدار اور بنیاد نہیں ہیں، عبادات اور شرائع محض ظاہری رسوم ہیں، یہ دین کی حقیقت اور دین کی روح نہیں ہیں، بلکہ محض ظاہری شکل و صورت اور جسم ہیں، اگر موصوف کی اس رائے سے

اتفاق کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کو دین میں کچھ ایسی حیثیت حاصل نہ ہو، جن کو تسلیم کرنا ناگزیر ہو۔

اس کے علاوہ سرسید کی طرح وہ بھی معجزات اور خوارقِ عادت کی تاویل و توجیہ کی طرف مائل تھے، اس لئے قرآن کی تفسیر میں انہوں نے جابجا ان آیات کو مجازی معنیٰ اور تشبیہات پر محمول کیا ہے، جہاں کہ معجزہ اور خارق عادت امر کا ذکر ہے۔ قرآن پاک میں ایک جگہ یہودیوں کی ایک سزا کا ذکر ہے کہ ان کی صورتیں مسخ کر دی گئیں اور وہ بندر بنا دئے گئے، مولانا نے یہاں "کونوا قردۃ خاسئین" کی تفسیر میں یہ تاویل فرمائی ہے کہ تم بندر کی طرح ذلیل و خوار اور درجۂ انسانیت سے پست ہو جاؤ، حالانکہ باطنیہ اور معتزلہ کے علاوہ تمام مفسرین اہل سنت والجماعت نے اس آیت میں صورت اور جسم کا مسخ ہونا ہی مراد لیا ہے اور خود قرآن کے اسلوب بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں ایک موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مطالبہ پر "خرق عادت" کے ظہور کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چشم سر سے "بعث بعد الموت" اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا منظر دیکھنا چاہا اور وجہ اس کی یہ بتائی کہ ایمان تو پہلے ہی سے ہے، البتہ اگر میں اس طرح دیکھ لوں تو مزید طمانینت حاصل ہوگی، حکم الٰہی ہوا کہ چار پرندوں کے مختلف ٹکڑے کئے جائیں اور انہیں مختلف پہاڑیوں پر رکھ دیا جائے، تاکہ اللہ تعالیٰ کی اس قدرت کا کرشمہ دیکھا جائے کہ وہ کس طرح ریزوں کو جوڑ کر ایک زندہ جسم کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے اور انسان کی اس غلط فہمی کا ازالہ ہو کہ "الن بجمع عظامہ" چنانچہ پھر وہ پرندے زندہ کر دئے گئے، اور ان کے کٹے اور ٹوٹے ہوئے اجزا یک جا ہو گئے، اور مل گئے۔ یہی تفسیر اس کی صحابہ اور عام مفسرین سے مروی ہے۔ مگر مولانا آزاد کو اس میں عقل و خرد کی مخالفت محسوس ہوئی اور انہوں نے اسلام اور قرآن کو اس سے بچانے کے لئے ضروری سمجھا کہ ان تصریحات کو تشبیہ اور تمثیل کا جامہ پہنا کر تشریح کی جائے، چنانچہ ارقام فرماتے ہیں:

> "حضرت ابراہیمؑ کا ظہور ایک ایسے عہد میں ہوا تھا، جب کہ ان کے ملک میں اور ان کے ملک سے باہر کوئی گروہ بھی ایسا نہ تھا، جس میں قبولیت حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو، یہ حالت دیکھ کر انہوں نے کہا خدایا! تو کیوں کر اس موت کو زندگی سے بدل دے گا؟ اس پر اللہ نے دعوتِ حق کی انقلاب انگیز حقیقت پرندوں کی

مثال سے واضح کردی، اگر تم ایک پرندکو کچھ دنوں تک اپنے پاس رکھ کر ایسا تربیت یافتہ بنالے سکتے ہو کہ تمہاری آواز کو سنتا اور تمہارے بلانے پر اڑتا ہوا آجا سکتا ہے تو کیا گمراہ و متوحش انسان دعوتِ حق کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ اثر پذیر نہیں ہو جاسکتے کہ تمہاری صدائیں سنیں اور ان کا جواب دیں؟"

تفسیر قرآن میں مولانا کا یہ رنگ جابجا موجود ہے اور یہ ایک تکلیف دہ حقیقت ہے کہ سرسید کے بعد اردو میں شاید ان کی تفسیر سب سے زیادہ "تفسیر بالرائے" کی مریض ہے۔

مولانا کے قلم میں جو سمندر کا تموج، آتش فشاں کی حرارت مسلسل اور حسبِ موقع شبنم کی خنکی اور بادِ نسیم کی جانفزا خوش گواری ہے اور جس میں اردو کی تصنیف و تالیف کی دنیا میں آج تک ان کا ہمسر پیدا نہ ہو سکا۔ اگر ان کی یہ تفسیر اس طرح کی کمزوریوں سے خالی ہوتی اور محض مختصر حاشیوں کے بجائے پوری تفسیر ہوتی تو یہ ایک ایسی چیز ہوتی کہ اردو داں اور اردو خواں طبقہ کو ایک طویل عرصہ تک کسی اور تفسیر کی حاجت نہ ہوتی۔

"بیان القرآن":

یہ تفسیر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، جو بارہ ہلکی جلدوں پر مشتمل ہے، تفسیر کے حاشیہ پر مسائلِ تصوف میں "مسائل السلوک من کلام ملک الملوک" اور اس کا ترجمہ "رفع الشکوک" کے نام سے درج ہے۔ نیز عربی زبان ہی میں مشکل الفاظ کے معنیٰ، نحو، صرف، بلاغت، تجوید اور علم کلام کی بحثیں نیز ان آیات سے متعلق احادیث بھی درج ہے اور اس کا نام "وجوہ المثانی مع توجیہ الکلمات والمعانی" رکھا گیا ہے۔

قرآن مجید کا ترجمہ عام فہم ہے اور خاص بات یہ ہے کہ اس کے باوجود اس کی بھرپور سعی کی گئی ہے کہ ترجمہ میں الفاظ قرآنی کا پابند رہا جائے، تفسیر میں وہ انداز اختیار کیا گیا ہے، جو جلال الدین سیوطیؒ کا ہے، یعنی آیتوں کے ترجموں کے درمیان وضاحتی اور تشریحی جملے، ان مختصر فقروں بلکہ لفظوں میں بسا اوقات وہ کچھ کہہ جاتے ہیں، جس کے لئے دوسرے مصنفین کو صفحے کے صفحے لکھنے پڑتے ہیں اور پھر بھی الحجاب باقی رہ جاتا ہے، مگر ان کے اس قسم کے نکات سے وہی لوگ مستفید ہو سکتے ہیں جو مختلف تفسیروں تفسیروں کی نزاکتوں اور قرآن کی مشکلات سے واقف ہوں، اساتذہ اور علماء کے لئے نہایت

مفید تفسیر ہے، مولانا انور شاہ کشمیریؒ جیسے بلند پایہ شخصیت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس تفسیر کو دیکھنے کے بعد فرمانے لگے کہ "اب اردو زبان میں بھی علم آگیا ہے۔"

مولانا نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ ضعیف قسم کی تفسیری روایات کو تفسیر کی اساس نہ بنایا جائے، تفرد سے بچا جائے اور فقہی احکام میں احناف کی پوری پوری ترجمانی کی جائے، نیز آیاتِ قرآنی کے باہمی ربط و تعلق کو نمایاں کیا جائے۔

البتہ کتاب کی زبان علمی اور فنی ہے، عام لوگوں کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا مشکل ہے، مثلاً سورۂ بقرہ کے ایک خاص واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے بتانا چاہتے ہیں کہ محض مقتول کا یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص قتل کا مجرم ہے، جرم ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں:

"اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ محض مقتول کا بیان تعیینِ قاتل کے باب میں کافی دلیل ہے، بلکہ اس موقعۂ خاص پر وحی سے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا بیان مطابق واقع کے ہوگا، اور دوسرے مواقع پر یہ مطابقت للواقع کسی دلیلِ صحیح سے ثابت نہیں۔ فافترقا۔"

مولانا بتانا چاہتے ہیں کہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حقانیت جان لینا کافی نہیں، جب تک وہ حضورؐ پر ایمان نہ لائیں۔

"دوسرے یہ جاننا اضطراری تھا، جس سے وہ کارہ تھے اور ایمان تصدیقِ اختیاری کا نام ہے، جس میں طوع و تسلیم ہو، کیونکہ مامور بہ ہے اور مامور بہ کا اختیاری ہونا ضروری ہے۔"

مولانا نے سہولت کے لئے جا بجا ذیلی عنوانات لگا دیے ہیں، لیکن ان کا اسلوب بھی کچھ اس طرح ہوتا ہے:

"بیانِ خدعۂ اہلِ کتاب برائے تشکیک نو مسلمانان۔" "ملامت بر ضلال و اضلالِ اہلِ کتاب۔" "ترغیب مسلمانان بر تحمل شدائد و تائید از حبِ دنیا۔"

تفسیر ماجدی

یہ مشہور صاحبِ علم، انشاء پرداز اور قدیم و جدید کے جامع مولانا عبد الماجد دریابادیؒ کی

تفسیر قرآن ہے، نہایت سلیس رواں اور شستہ ترجمہ ہے، جدید ذہن کے شبہات کو جس طرح مولانا نے حل کیا ہے، غالباً کوئی اور تفسیر اس میں ان کی ہم پلہ نہیں ہے۔ مولانا کی تفسیر ان کی وسعتِ مطالعہ کی شاہد ہے سلف و خلف اور مختلف مسلک و مشرب کی اکثر تفسیریں ان کی نظر میں رہی ہیں، اختصار و ایجاز ایسا رہا ہے کہ مطلب خبط بھی نہ ہو اور اس سے زیادہ ممکن بھی نہ ہو، کثرت سے مفسرین کی عبارتوں کے اقتباسات نقل کرتے ہیں اور وہ بھی اتنے مختصر ہیں کہ اردو قارئین کے لئے بار خاطر نہ ہوں، خوب پڑھ کر اور پی کر لکھتے ہیں۔ دوسرے مذاہب کی مذہبی کتابوں پر وسیع نظر ہے، ہر جگہ قرآن مجید سے ان کا تقابل کیا ہے اور قرآن کی برتری اور تاریخی حقائق سے ہم آہنگی اور مطابقت کو واضح کیا ہے، علماء ہند میں مولانا تھانویؒ سے زیادہ استفادہ کرتے ہیں اور "مرشد تھانوی" سے ان کو یاد کرتے ہیں، جدید مغربی مصنفین کی تالیفات و تحقیقات اور انسائیکلوپیڈیاؤں سے بھی خوب فائدہ اٹھایا ہے، مدرسین اور اساتذہ کے لئے میرا تجربہ ہے کہ اردو تفسیروں میں اس سے بہتر کوئی اور تفسیر نہیں، البتہ یہ ضرور ہے کہ اس تفسیر سے اہلِ علم اور اہلِ ذوق زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، عام لوگوں کو شاید اس سے اس درجہ نفع نہ پہونچ سکے، خود رائی نہیں ہے، سلف صالحین کی تفسیر و تشریح سے انحراف نہیں کرتے —— حیرت ہے کہ مولانا کی یہ تفسیر اپنی ان خوبیوں، بلکہ بہت سی خوبیوں میں اپنی انفرادیت کے باوجود اس درجہ قبولِ عام کیوں حاصل نہ کر سکی جو اس کا حق ہے۔

تفہیم القرآن

یہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ بانی جماعت اسلامی کی تفسیر ہے، جو چھ جلدوں میں ہے اب تک ہند و پاک میں اس کے پچاسوں ایڈیشن نکل چکے ہیں اور مختلف زبانوں میں اس کی تلخیص بھی شائع ہوئی ہے، خود مصنف کے حسب تحریر اس میں ترجمہ کے بجائے ترجمانی کی گئی ہے اور اس لحاظ سے میری نظر میں ان کا ترجمہ اور ترجمانی مولانا آزاد کی سعی پر فوقیت رکھتا ہے۔

اس تفسیر میں بعض چیزیں بڑی عمدہ ہیں، سورۂ نور، سورۂ احزاب اور پارہ ۲ کی تفسیر اپنی مثال آپ ہے، اور نہ صرف اردو، بلکہ عربی کی بھی اکثر تفسیروں سے بہتر ہے، اسی طرح مصنف نے سود، پردہ، ختم نبوت، اسلام کے تعزیری قوانین، مسئلہ رجم، تعدد ازدواج وغیرہ مسائل پر بڑی عمدہ بحثیں کی ہیں۔

محصنات کی تشریح، سورۂ تکویر وغیرہ میں قیامت سے متعلق جو کیفیات نقل کی گئی ہیں، جدید انکشافات اور سائنس پر اس کی تطبیق اس عمدگی سے کی ہے کہ اس کی داد نہ دینا ناانصافی ہوگی۔ اسی طرح جا بجا حجیت حدیث پر بڑا پر مغز کلام کیا گیا ہے اور منکرین حدیث پر مؤثر تنقیدیں کی گئی ہیں، آیت قصاص میں قرآن کا ترجمہ بہت نفیس ہے، جو احناف کے مسلک کے عین مطابق ہے۔ سورۂ بقرہ میں بنو اسرائیل کی سنہری گائے کو ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، اس پر بڑی حکیمانہ روشنی ڈالی گئی ہے، سورۂ صف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بائبل میں بشارت پر خوب کلام کیا گیا ہے۔

بحیثیت مجموعی قرآن میں مذکور ارضیات اور مقامات پر بڑی عمدہ تحقیق ہے، اور مصنف نے اس کے لئے باضابطہ ایک طویل سفر کیا ہے۔ اسی طرح قرآن اور بائبل کے تقابل پر بھی خصوصی توجہ دی گئی ہے، ہر سورہ کے شروع میں اس سورہ کے نزول کا پس منظر، اس میں آنے والے اہم مضامین وغیرہ پر جو افتتاحیہ لکھا گیا، وہ بھی بہت خوب ہے اور زبان و اسلوب کا تو پوچھنا ہی کیا ہے!!

لیکن افسوس کہ اس تفسیر میں بعض خامیاں اور کوتاہیاں ایسی رہ گئی ہیں کہ اصحاب انصاف کے لئے ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے۔ اول تو ابتدائی جلدوں میں انہوں نے سلف کے تفسیری ذخیرہ کے بجائے اپنے فہم کو زیادہ مدار بنایا ہے۔ مولانا کو شاید خود بھی اس کا احساس ہوگیا تھا، اس لئے وہ اواخر عمر میں اس پر نظر ثانی کرنا چاہتے تھے، لیکن عمر نے وفا نہ کی اور وہ جان آفریں سے جا ملے

کہیں کہیں فوق العادات امور کے سلسلے میں انہوں نے وہ راہ اختیار کرلی ہے، جو سرسید اور ان کے ہم قدم متجددین کی ہے، مثلاً قرآن مجید نے بنو اسرائیل کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ ان کے اوپر کوہ طور اٹھا لیا گیا: "ورفعنا فوقکم الطور" مولانا مودودی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ طور اٹھا لیا گیا، بلکہ پہاڑ کے ساتھ کچھ ایسی صورت پیدا کردی گئی کہ وہ گھبرا گئے۔ "انشقاق قمر" (   ) سے متعلق مولانا کی تفسیر بھی اسی رنگ کی ہے۔ تاہم معجزات کے انکار کے بارے میں ان کو سرسید کا ہم قدم اور متبع قرار دینا بھی عدل نہ ہوگا۔

ان کا قلم کہیں کہیں سلف صالحین بلکہ صحابۂ کرامؓ اور حضرات انبیاءؑ کی شان میں "شوخی" کر گیا ہے، مثلاً حضرت موسیٰ کے لئے جلد باز فاتح کا لفظ۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے سے محبت کو "جذبۂ جاہلیت" قرار دینا، (ج ۲، ص ۳۴۴) حضرت داؤدؑ کے ایک خاتون سے نکاح کو "حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال"

سے تعبیر کرنا (ج ۴ ص ۲۴۲) حضرت یونس ؑ کو بے صبر اور فریضۂ رسالت کی ادائیگی میں کوتاہ قرار دینا (ج ۲، ص ۳۱۳) اور حضرت آدم ؑ کے بارے میں یہ تعبیر اختیار کرنا کہ "وہ اطاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جاگرے" (ج ۳ ص ۱۳۳) اسی طرح غزوۂ احد کے واقعہ کے بعد حرمتِ سود کا حکم لانے کی وجہ یہ بیان کرنا کہ صحابہؓ کے اندر حبِ مال و دنیا پیدا ہو گئی تھی —— وغیرہ وغیرہ۔

یہ مولانا کی تفسیر کا سب سے تکلیف دہ پہلو ہے اور ان کے اسلوب کے مداح اور طریق استدلال و استنباط کے معترف کی حیثیت سے دکھ ہوتا ہے کہ کاش! ان کا قلم ان باتوں سے اپنا دامن آلودہ نہ کرتا اور ان موضوعات پر وہ راہ اختیار کرتا جو سلف صالحین کا ہے۔

نیز قرآن مجید کے اکثر مقامات پر رب، عبادت، اقامت دین، خلافتِ الٰہیہ، انبیاءؑ کی دعوت الی اللہ وغیرہ کا ذکر ہے وہاں انہوں نے پوری کوشش کی ہے کہ کسی طرح ان کلمات کو حکومت الٰہیہ اور اسلام کے نظام سیاسی کے ہم معنی ثابت کیا جائے۔ حکومتِ اسلامی کا قیام بے شک مسلمانوں فرض ہے لیکن اس کے لئے اسلامی اصطلاحات اور قرآنی تعبیرات پر زیادتی اور بہ تکلف ان کو اپنے منشاء و مقصد پر انطباق کسی طرح بھی قرین عدل نظر نہیں آتا۔

اگر یہ تفسیر ان کمزوریوں سے خالی ہوتی تو مصنف کے قلم کو اللہ نے جس جادو نگاری، قوت و تاثیر اور تفہیم و تعبیر پر قدرت سے نوازا ہے، نیز جس طرح وہ جدید و قدیم علوم کے جامع ہیں اور تجزیہ کی صلاحیت اور قوتِ فیصلہ ہے، اس کے تحت یہ اردو زبان کی بڑی مفید تفسیر ہوتی اور مسلمانوں کے ایک بڑے حلقہ اور مصنف کے درمیان اختلاف کی جو دبیز دیوار حائل ہو گئی ہے وہ نہ ہوتی۔ (عفی اللہ عنہ)

معارف القرآن

یہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی تفسیر ہے، جو میری نگاہ میں اردو کی تمام تفسیروں میں مجموعی حیثیت سے بہتر، عمدہ اور محتاط ہے۔ اس میں ترجمہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کا اور خلاصۂ تفسیر مولانا اشرف علی تھانویؒ کا شامل ہے، مفتی صاحبؒ خود "معارف و مسائل" کے عنوان سے آیات کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں۔ یہ آٹھ جلدوں میں ہے۔ یوں تو تفسیر کی اکثر اہم اور مشہور کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، لیکن تین کتابیں اس کا بنیادی ماخذ ہیں۔ ابو عبداللہ قرطبیؒ کی "الجامع لاحکام القرآن" مولانا ثناء اللہ پانی پتیؒ

کی "تفسیر مظہری" اور مولانا تھانویؒ کی "بیان القرآن"۔

اس تفسیر میں مختلف خوبیاں جمع ہو گئی ہیں، مفسر کے خاص مذاق کے مطابق فقہ پر زیادہ زور دیا گیا ہے اور جدید مسائل پر بھی جا بجا بحثیں کی گئی ہیں، صرف علمی اور قانونی انداز کی بحث کرنے کی بجائے تذکیر و موعظت کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے، فضائل و ترغیب و ترہیب کی روایات نقل کی گئی ہیں، جدید شبہات و اعتراضات کا رد کیا گیا ہے، صرف قوی اور راجح اقوال نقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، زبان عام فہم ہے، اس طرح یہ عوام و خواص اور جدید و قدیم ہر طبقہ کے لئے نافع ہے۔

اس کا خاص خیال رکھا گیا ہے کہ کوئی بات سلف صالحین کی تشریح کے خلاف نہ آ جائے، مختلف جگہ نام لئے بغیر صاحب تفہیم القرآن پر تنقیدیں کی گئی ہیں، اعجاز، خلافتِ ارض، سود، ختم نبوت اور حجیت حدیث وغیرہ پر عمدہ بحثیں ہیں، پہلی اور آخری جلد میں زیادہ بسط و تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔

نسبتاً واقعات اور قصص پر کم لکھا گیا ہے، چونکہ بیماری کی حالت میں بہت عجلت میں یہ تفسیر لکھی گئی، اس لئے بہت سی جگہوں پر صرف خلاصۂ تفسیر سے کام لیا گیا ہے، جہاں کہیں کہیں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔

کتاب کے آغاز میں مصنف کے خلف رشید مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا ایک جامع و مفید مقدمہ بھی ہے، جس میں علوم قرآن سے متعلق ضروری معلومات درج ہیں۔

تدبر قرآن

مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر ہے جس میں خصوصیت سے مشہور مفسر مولانا حمید الدین فراہی کے افکار و خیالات پیش کئے گئے ہیں، مصنف نے ضعیف روایات اور اسرائیلیات سے احتیاط کیا ہے، ایک آیت کی خود دوسری قرآنی آیت سے تشریح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، آیاتِ قرآنی کے باہمی ربط پر خصوصی توجہ کی گئی ہے اور اس کے لئے سورتوں کو مختلف معنوی گروپس میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے اور زبان "تفہیم القرآن" کے بعد اردو کی تفسیروں میں غالباً سب سے بہتر ہے۔ یہ تفسیر عوام سے زیادہ خواص کے لئے مفید ہے۔

یہ دیکھ کر گرانی ہوتی ہے کہ انہوں نے بعض مقامات پر ایسی تفسیر کی ہے، جو باطنیہ، معتزلہ

کے منکرین اور تجدد پسندوں جیسی ہوتی ہے ــــــ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مقتول کے قاتل کے دریافت کے لئے ان کو ایک گائے ذبح کرنے اور اس کے ایک حصہ سے مقتول کو مارنے کا حکم دیا گیا کہ اس طرح وہ زندہ ہو کر اٹھے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا، مگر مولانا اصلاحی نے اس سے بالکل عجیب و غریب نوعیت کا معنیٰ اخذ کیا ہے، فرماتے ہیں:

"لیکن قسامہ کے تعلق سے کبھی کبھی مجھے یہ خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے یہ قسم لینے کی طرف اشارہ ہو، یعنی مقتول پر قربان کی ہوئی گائے کا خون چھڑکو اور آس پاس والوں سے قسم لو۔" (ج ا، ص ۲۴۸)

قرآن کریم نے حضرت مریمؑ کو غیر معمولی طور پر منجانب اللہ بے موسم کے پھل عطا کئے جانے کا ذکر کیا ہے، جس کو دیکھ کر حضرت زکریاؑ کو خیال آیا، کہ ہم بھی بوڑھاپے میں خدا سے بچے کی دعا کریں، مگر مولانا اصلاحی کو رزق رب کی یہ مابعد الطبیعی تفسیر نہ بھائی، وہ فرماتے ہیں:

"رزق سے مراد یہاں حکمت، معرفت ہے، قرآن نے وحی و ہدایت کے لئے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے" (ج ا، ص ۶۸۰)

قرآن مجید نے بنی اسرائیل پر تہدید کے بطور "کوہ طور" اٹھا لینے کا ذکر کیا ہے، مولانا نے جمہور سے الگ اس کی تفسیر کی ہے، لکھتے ہیں:

"اگر زلزلہ کے وقت کسی اونچی دیوار کے زیر سایہ، یا پہاڑ کے دامن میں بیٹھا ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں، اسی حالت کو قرآن نے طور کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے"۔ (ج ا ص ۱۹۹)

اسی طرح مولانا شادی شدہ زنا کے مجرمین کے لئے "رجم" کے قائل نہیں ہیں، ایک ایسے آدمی کے لئے جو حدیث کی حجیت کا قائل ہو، رجم کا انکار حیرت انگیز ہے! ــــــ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ اس تفسیر کا اسلوب عالمانہ ہے، اور مولانا کے تدبر فی القرآن کا ثبوت اور ان کی ذکاوت کا شاہد عدل ہے، کاش! وہ ان خامیوں سے پاک ہوتی۔

چند اہم جدید طبی اور معاشی مسائل

مورخہ ۸/۹/۱۰/۱۱ دسمبر ۱۹۸۹ء، روز جمعہ، شنبہ، یکشنبہ اور دوشنبہ کو انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹیڈیز دہلی کے تعاون سے اسلامی فقہ اکیڈیمی (IFA) کے زیر اہتمام "ہمدرد سمینار ہال" ہمدرد نگر دہلی میں دوسرا فقہی سمینار منعقد ہوا جس میں ہند و بیرونِ ہند کے ستر نمائندہ اور ممتاز علماء فقہ اور جدید معاشیات کے ماہرین شریک ہوئے ان حضرات نے بینک انٹرسٹ، ہندوستان کی شرعی حیثیت ہندوستان میں ملنے والے سودی قرضے، نوٹوں اور سکوں کے شرعی اور فقہی احکام پر عالمانہ بحث کی اور فیصلے کئے، اس کے علاوہ اعضاء کی پیوند کاری اور کرایہ داری کے ساتھ مروجہ پگڑی کے مسائل ——— جو گذشتہ سمینار میں زیر بحث آئے تھے اور ابھی فیصلہ طلب تھے، ان پر بھی تجویزیں طے پائیں، ان تجویزوں کا متن ذیل میں درج کیا جاتا ہے ——— دار العلوم سبیل السلام سے بھی مولانا محمد رضوان القاسمی (ناظم مدرسہ ھذا) مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (صدر مدرس) اور مولانا زبیر احمد قاسمی (شیخ الحدیث) نے اس سمینار میں شرکت کی (ادارہ)

تجارتی سود اور اسلامی شریعت

سود خواہ ذاتی مصارف کے قرضوں پر لیا دیا جائے، یا تجارتی و کاروباری قرضوں پر، شریعتِ اسلامیہ کی نظر میں بہر حال حرام ہے۔ یہ سمجھنا کہ سود کی حرمت کا اطلاق تجارتی و کاروباری قرضوں پر نہیں ہوتا قطعاً غلط ہے، نیز یہ خیال کہ تجارتی و کاروباری قرضوں کا وجود زمانہ نزولِ

قرآن میں نہیں پایا جاتا، اس لئے حرمتِ ربوا کا اطلاق ان پر نہیں ہوگا، کسی طرح درست نہیں۔

یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ تجارتی کاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین عرب جاہلیت، نیز ان قوموں میں جن سے جاہلی عربوں کے تجارتی روابط تھے رائج اور شائع تھے۔ چنانچہ تجارتی و کاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین تحریم ربوا کا اولین مورد ہے، اس کے علاوہ بالفرض اگر تجارتی وکاروباری مقاصد کے لئے سودی لین دین کا وجود زمانۂ نزولِ قرآن میں نہ بھی پایا جاتا تب بھی مستقل شرعی دلائل دونوں قسم کے قرضوں (ذاتی و شخصی اور تجارتی وکاروباری) پر اضافے یعنی سود کی حرمت کے بارے میں قائم ہیں۔ قرآن وسنت، اجماع وقیاس اور امتِ محمدیہ کا عمل متوارث سب یہی بتاتے ہیں کہ حرمت ربوا کے بارے میں اس کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا کہ قرض لینے دینے کا مقصد اور محرک کیا ہے؟

سود کی حرمت پر اس کا بھی کوئی اثر نہیں پڑتا کہ شرح سود کم ہے یا زیادہ، مناسب حد تک کم ہے یا مناسب حد تک زیادہ، شریعتِ اسلامیہ میں اس بات کو تسلیم کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ شرح سود اگر مناسب حد تک کم ہے تو سودی لین دین جائز ہے اور اگر نامناسب حد تک زیادہ ہے تو اس میں کوئی فرق نہیں کیا ہے اور دلائلِ شرعیہ اس طرح کی کسی تفریق کی اجازت نہیں دیتے۔

سود اور سودی قرض سے متعلق مسائل

۱۔ ربوٰا (سود) قطعی حرام ہے اور جس طرح سود لینا حرام ہے، اسی طرح سود دینا بھی حرام ہے۔

۲۔ سود ادا کرنے کی حرمت بذاتِ خود نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ یہ سود خواری کا ذریعہ ہے، اس لئے بعض خاص حالات میں عذر کی بنیاد پر سود ادا کر کے قرض لینے کی اجازت دی جاسکتی ہے، کون سا عذر معتبر ہے اور کون سا نہیں اور کون سی حاجت قابلِ لحاظ ہے اور کون سی قابلِ لحاظ نہیں، اس سلسلے میں معتمد اصحابِ افتاء کے مشورہ پر عمل کیا جائے۔

(٣) ہندوستان میں محض سرکاری قرضے ایسے ہیں جس میں سرکار کی طرف سے چھوٹ (SUBSIDY) دی جاتی ہے اور سود کے نام سے اضافی رقم بھی لی جاتی ہے، اگر سود کے نام سے لی جانے والی یہ اضافی رقم چھوٹ (SUBSIDY) کے مساوی ہو، یا اس سے کم ہو تو یہ اضافی رقم شرعاً سود نہیں۔

(۴) ہندوستان میں حکومت جب اراضی مملوکہ کو اکوائر کرتی ہے (یعنی بحکم سرکاری وہ اراضی مفاد عامہ کے لئے جبراً خریدی جاتی ہے) اور حکومت اس کی قیمت مالکانِ اراضی کو اپنے ضابطوں کے پیشِ نظر اپنی منشاء کے مطابق ادا کرتی ہے، مالکانِ اراضی سرکاری حکم کے خلاف عدالتوں سے رجوع کرتے ہیں، عدالتیں عادلانہ قیمت کا تعین کرتی ہیں اور مالکانِ اراضی کو اکوزیشن کی تاریخ سے بذریعہ فیصلہ عدالت اس قیمت کے علاوہ اضافی رقم بھی سود کے نام سے دلاتی ہیں۔ سمینار کی رائے میں یہ اضافی رقم سود نہیں، بلکہ قیمت کا جزء ہے، جس کا لینا اور اپنے مصرف میں خرچ کرنا جائز ہے۔

(۵) سرکاری بینکوں سے ملنے والے ترقیاتی قرضوں اور ان میں ادا کئے جانے والے سود کے مسئلہ پر ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں غور کر کے کسی فیصلہ تک پہونچنے کے لئے یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے علماء و متخصصین کی ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے، جو مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر کسی نتیجہ تک پہونچے۔

بینک انٹرسٹ کے سود ہونے پر شرکاء سمینار کا اتفاق ہے، انٹرسٹ کی رقم بینک سے نکالی جائے، یا چھوڑ دی جائے! نکال لی جائے تو کس مصرف میں خرچ کی جائے، اس سلسلہ میں درج ذیل امور طے پائے۔

(۱) بینک سے ملنے والی سود کی رقم کو بینکوں میں نہ چھوڑا جائے بلکہ اسے نکال کر مندرجہ ذیل مصارف میں خرچ کیا جانا چاہیئے۔

(۲) بینک کے سود کی رقم کو بلا نیت ثواب فقراء و مساکین پر خرچ کر دیا جائے اس پر تمام ارکان کا اتفاق ہے۔

(۳) سود کی رقم کو مساجد اور اس کے متعلقات پر خرچ نہیں کیا جاسکتا۔

(۴) اکثریت کا سمینار کی یہ رائے ہے کہ اس رقم کو صدقاتِ واجبہ کے مصارف کے علاوہ رفاہ عام کے کاموں پر بھی خرچ کیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات کی رائے میں اس کے مصرف کو فقراء ومساکین تک محدود رکھنا چاہیئے۔

دارالاسلام، دارالحرب اور مختلف ممالک کی حیثیت کا تعین

دارالحرب میں عقودِ فاسدہ کے جواز، یا یہ کہ دارالحرب میں سود کے ثبوت کی ضروری شرط اموال کا معصوم ہونا موجود نہیں، اسلئے دارالحرب میں سود کا تحقق ہی نہیں ہوتا اور آیا ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں اور یہ کہ ہندوستانی جمہوریہ دارالکفر ہوتے ہوئے بھی ان ممالک کی فہرست میں آتا ہے یا نہیں، جن میں اموال معصوم نہیں رہتے، یہ اور اس طرح کے دیگر سوالات پر سمینار میں غور کیا گیا اور مسئلہ کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا، اگرچہ سمینار میں عام رجحان یہ رہا کہ ہندوستان جیسے ملکوں میں سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا جاسکتا، لیکن پھر بھی مقالات ومباحث میں آنے والے مختلف نقاطِ نظر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے ایسی کمیٹی تشکیل دینے کی سفارش کرتا ہے، جس میں محقق علماء وفقہاء کے علاوہ ماہرینِ علم سیاست، دستوری قوانین، اور بین الاقوامی تعلقات سے متعلق قوانین کے ماہرین کو شریک کیا جائے، یہ کمیٹی اس کا جائزہ لے کہ اسلام کی دستوری ہدایات اور اسلامی قانون بین الممالک کی روشنی میں آج کے مختلف نظام ہائے حکومت کو کتنی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، اور ان کے علیحدہ علیحدہ کیا حکم ہوں گے، اس سلسلے میں دو ممالک کے باہمی تعلقات اور ان میں سے ایک کے لئے دوسرے کی حیثیت، اور ساتھ ہی خود اس ملک میں بسنے والی مسلم آبادی کی اپنے ہم وطنوں اور اپنے ملک کی حکومت کے ساتھ تعلقات کی قانونی نوعیت شرع اسلامی کی روشنی میں کیا ہونی چاہیئے۔ یہی کمیٹی اس پر بھی غور کرے کہ کیا کچھ ایسے حالات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں معاملاتِ ربویہ اور عقودِ فاسدہ مسلمانوں کیلئے غیر مسلموں کے ساتھ جائز قرار دئے جائیں۔

غیر سودی بینک کاری کیلئے پروجکٹ کی تیاری

دوسرا فقہی سمینار، سودی معاملات سے متعلق غور وفکر کے ذیل میں اس نتیجہ پر پہونچا،

کہ غیر سودی بینک کاری اور مقامی سطح پر ایسی سوسائٹیز کا قیام جو غیر سودی بنیادوں اور جائز شرعی عقود و معاملات کی بنیاد پر سرمایہ کاری اور امداد فراہم کرنے کا کام مفید ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ان کاموں کی انجام دہی کے لئے ایسے نظام سامنے ہوں، جو شرع سے متصادم نہ ہوں، اس وقت ملک میں ایسی مختلف کوششیں جاری ہیں، لیکن ان کوششوں میں باہم تنظیم اور یکسانیت کا فقدان ہے یہ سمینار ضروری سمجھتا ہے کہ جدید بینکنگ کے اصولوں اور شریعت کے احکام کو سامنے رکھتے ہوئے غیر سودی بینک کاری کا ایک جامع منصوبہ (PROJECT) تیار کیا جائے، جو نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کو سود کی حرمت سے بچائے اور ان کو معاشی استحکام بخشے، بلکہ دیگر پسماندہ اور کمزور انسانی طبقات کو بھی سہارا دے سکے، جو امتِ رحمۃ للعالمین کا فریضہ ہے۔

اس سلسلہ میں یہ سمینار اسلامک فقہ اکیڈمی سے ایسے خاکہ اور منصوبہ (PROJECT) کی تیاری کے لئے علماء و فقہاء، نیز بینکنگ اور معاشیات کے ماہرین پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل کی سفارش کرتا ہے۔

کرنسی نوٹ کا مسئلہ

موجودہ دور میں سونا چاندی ذریعہ تبادلہ نہیں رہا اور کاغذی نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں سونے چاندی کی جگہ لے لی ہے، حکومت کے قوانین بھی کاغذی نوٹوں کو مکمل طور پر ثمن کی حیثیت دیتے ہیں اور بحیثیت ثمن نوٹوں کو قبول کرنا لازم قرار دیتے ہیں، غرضیکہ کاغذی نوٹوں کی حیثیت عرف اور رواج میں زرِ قانون کی ہو گئی ہے، کرنسی کے اس ہمہ گیر رواج نے جو شرعی اور فقہی مسائل پیدا کئے ہیں، ان کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لینے اور غور و خوض کرنے کے بعد شرکاء سمینار درج ذیل نکات پر متفق ہوئے۔

(۱) کرنسی نوٹ سند و حوالہ نہیں ہے، بلکہ ثمن ہے، اور اسلامی شریعت کی نظر میں کرنسی نوٹ کی حیثیت زرِ اصطلاحی و قانونی کی ہے۔

(۲) عصر حاضر میں نوٹوں نے ذریعہ تبادلہ ہونے میں مکمل طور پر زرِ خلقی (سونا چاندی) کی جگہ لے لی ہے اور باہمی لین دین نوٹوں کے ذریعہ انجام پاتا ہے، اس لئے کرنسی نوٹ بھی احکام میں

ثمنِ حقیقی کے مشابہ ہے، لہٰذا ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ اسی ملک کی کرنسی سے کمی و بیشی کے ساتھ نہ تو نقد جائز ہے نہ ادھار۔

(۳) دو ملکوں کی کرنسیاں دو اجناس ہیں، اس لئے ایک ملک کی کرنسی کا تبادلہ دوسرے ملک کی کرنسی سے کمی و بیشی کے ساتھ حسب رضائے فریقین جائز ہے۔

(۴) کرنسی نوٹوں پر زکوٰۃ لازم ہے۔

(۵) نوٹوں میں زکوٰۃ کا نصاب، چاندی کے نصاب کی قیمت کے مساوی ہوگا۔

(۶) مؤخر مطالبات کے سلسلہ میں کرنسی نوٹوں کی قوت خرید اور قدر و قیمت میں ہونے والے اتار چڑھاؤ کا احکامِ شرعیہ میں اعتبار کیا جائے یا نہیں۔

اس سلسلہ میں شرکاء سمینار کے درمیان دو نقطہائے نظر پائے جاتے ہیں، کمیٹی کی رائے میں اس مسئلہ کے بارے میں کوئی فیصلہ آئندہ مزید غور و فکر کے بعد کیا جائے گا۔

(۷) اس اجلاس کا احساس ہے کہ مہر کی سونے اور چاندی کے ذریعہ تعیین عمل میں آئے تاکہ پوری طرح عورتوں کے حقوق کا تحفظ ہوسکے اور سکّوں کی قوتِ خرید میں کمی کی وجہ سے ان کو نقصان نہ پہونچے۔

پگڑی کا مسئلہ

(۱) مالکِ مکان زرِ ضمانت و ڈپوزٹ کے نام سے کرایہ دار سے جو پیشگی رقم وصول کرتا ہے بہتر ہے کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھا جائے، اگر مالک اس کو خرچ کرے تو وہ اس بات کا ضامن ہوگا کہ کرایہ داری کی مدت ختم ہوتے ہی وہ رقم کرایہ دار کو فوراً واپس کرے۔

(۲) اگر کوئی مکان یا دکان کرایہ پر دیا جائے اور مالک مکان مروجہ پگڑی کے نام پر اصل ماہوار کرایہ کے علاوہ بھی یکمشت رقم کرایہ دار سے وصول کرے تو سمجھا جائے گا کہ مالکِ مکان نے بحیثیتِ مالک اپنے مکان کو کرایہ دار سے واپس لینے کے حق سے دست برداری کا عوض وصول کرلیا ہے اور یہ رقم اس کے لئے اس حق کے عوض ہونے کی بنیاد پر جائز ہوگی۔ آئندہ اگر مالکِ مکان کرایہ دار سے مکان واپس لینا چاہے تو کرایہ دار کو اس کا حق ہوگا کہ وہ مکان خالی کرنے کا

عوض جس پر ہر دو فریق راضی ہو جائیں مالکِ مکان سے وصول کرلے اور اس صورت میں کرایہ دار دوسرے کرایہ دار کے حق میں باہمی طے شدہ رقم کے عوض اپنے اس حق سے جو اس نے اصل مالک سے عوض دے کر حاصل کیا تھا دست بردار ہو سکتا ہے۔

(۳) مالکِ مکان نے پگڑی لئے بغیر مکان کرایہ پر دیا اور اجارہ کی مدت اصل معاہدہ میں مقرر نہیں کی گئی ہو تو اس صورت میں مالکِ مکان کو حق ہوگا کہ جب چاہے مکان خالی کرالے، البتہ مالکِ مکان کو چاہئے کہ خالی کرانے کی نوٹس اور خالی کرنے کی تاریخ کے درمیان ایسی مہلت دے، جو مقامی حالات کے پیشِ نظر مناسب ہو اور جس میں مالک اور کرایہ دار کو کوئی خاص ضرر لاحق نہ ہو اور کرایہ دار کو بھی چاہئے کہ اس مناسب مہلت میں مکان خالی کردے۔

(۴) جو مکان یا دکان بغیر پگڑی لئے کرایہ پر دی گئی ہو، مالک مکان کو مکان واپس کرتے وقت کرایہ دار کے لئے اس سے پگڑی طلب کرنا جائز نہ ہوگا۔

(۵) سمینار مسلمانوں کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ اپنے معاملات میں شریعت کا خاص خیال رکھیں، شریعت چاہتی ہے کہ کسی بھی معاہدے کے بارے میں معاہدہ کے ہر دو فریق تمام ضروری متعلق امور کو وضاحت اور صراحت کے ساتھ باہم طے کرلیں، تاکہ آئندہ کوئی نزاع پیدا نہ ہو، اور فریقین ضرر سے محفوظ رہیں، اس سلسلہ میں سمینار خصوصیت سے یہ سفارش کرتا ہے کہ کرایہ داری کا معاہدہ طے کرتے وقت مدت کا تعین کرلیا جائے اور اگر مالکِ مکان عوض لے کر ہمیشہ کیلئے اپنے خالی کرانے کے حق سے دست بردار ہونا چاہتا ہے تو فریقین صراحۃً آپس میں اس کو طے کرلیں۔

اعضاء کی پیوند کاری

(۱) کسی انسان کا کوئی عضو ناکارہ ہو چکا ہو اور اس عضو کے عمل کو آئندہ جاری رکھنے کیلئے کسی متبادل کی ضرورت ہو تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ؛

(الف) غیر حیوانی اجزاء کا استعمال۔

(ب) ایسے جانوروں کے اعضاء کا استعمال جن کا کھانا شرعاً جائز ہے اور جو بطریقہ شرعی ذبح کئے گئے ہوں۔

(ج) جان کی ہلاکت یا عضو کے ضائع ہونے کا قوی خطرہ ہو اور اس مطلوبہ عضو کا بدل صرف ایسے جانوروں میں ہی مل سکتا ہے، جن کا کھانا حرام ہے، یا حلال تو ہے، لیکن بطریقِ شرعی ذبح نہیں کئے گئے ہیں تو ایسی صورت میں ان غیر ماکول اللحم یا ماکول اللحم مگر غیر مذبوح جانوروں کے اعضاء کا استعمال جائز ہے۔

اور اگر جان یا عضو کی ہلاکت کا شدید خطرہ نہ ہو تو خنزیر کے اجزاء کا استعمال جائز نہیں۔

(۲) اسی طرح ایک انسان کے جسم کا ایک حصہ اسی انسان کے جسم میں بوقت حاجت استعمال کیا جانا جائز ہے۔

(۳) اعضاء انسانی کا فروخت کرنا حرام ہے۔

(۴) اگر کوئی مریض ایسی حالت کو پہونچ جائے کہ اس کا کوئی عضو اس طرح بے کار ہو کر رہ گیا ہے کہ اگر اس عضو کی جگہ دوسرا عضو اس کے جسم میں پیوند نہیں کیا جائے تو قوی خطرہ ہے کہ اس کی جان چلی جائے گی اور سوائے انسانی عضو کے کوئی دوسرا متبادل اس کمی کو پورا نہیں کر سکتا اور ماہر، قابلِ اعتماد اطباء کو یقین ہے کہ سوائے عضوِ انسانی کی پیوند کاری کے کوئی راستہ اس کی جان بچانے کا نہیں ہے، اور عضوِ انسانی کی پیوند کاری کی صورت میں ماہر اطباء کو ظن غالب ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی اور متبادل عضوِ انسانی اس مریض کے لئے فراہم ہے، تو ایسی صورت مجبوری اور بے بسی کے عالم میں عضوِ انسانی کی پیوند کاری کرا کر اپنی جان بچانے کی تدبیر کرنا مریض کے لئے مباح ہوگا۔

(۵) اگر کوئی تندرست شخص ماہر اطباء کی رائے کی روشنی میں اس نتیجہ پر پہونچتا ہے کہ اگر اس کے دو گردوں میں سے ایک گردہ نکال لیا جائے تو بظاہر حال اس کی صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑے گا، اور وہ اپنے رشتہ دار مریض کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ اس کا خراب گردہ اگر نہیں بدلا گیا تو بظاہر حال اس کی موت یقینی ہے اور اس کا کوئی متبادل موجود نہیں ہے، تو ایسی حالت میں اس کے لئے جائز ہوگا کہ وہ بلا قیمت اپنا ایک گردہ اس مریض کو دے کر اس کی جان بچائے۔

(۶) اگر کسی شخص نے یہ ہدایت کی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے اعضاء پیوند کاری کے لئے استعمال کئے جائیں، جسے عرف عام میں وصیت کہا جاتا ہے۔

ازروئے شرع اسے اصطلاحی طورپر وصیت نہیں کہا جاسکتا اور ایسی وصیت اور خواہش شرعًا قابل اعتبار نہیں۔[۱]

---

[۱] پیوند کاری سے متعلق ان تجاویز پر جن حضرات نے دستخط کئے ہیں ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں :

۱۔ مولانا مفتی ظفیرالدین صاحب، مفتی دارالعلوم دیوبند۔
۲۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب خیرآبادی، مفتی دارالعلوم دیوبند۔
۳۔ مولانا محمد رفیع عثمانی، مفتی وصدر دارالعلوم کراچی (پاکستان)
۴۔ مولانا مفتی سعید احمد پالنپوری، استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند۔
۵۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب، مفتی مدرسہ امینیہ، دہلی۔
۶۔ مولانا مجیب اللہ ندوی، جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ۔
۷۔ مولانا محمد آدم پالنپوری، مفتی جامعہ نذیریہ کاکوسی ضلع مہسانہ گجرات
۸۔ مولانا انورعلی اعظمی، مفتی دارالعلوم مئو۔
۹۔ مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب، مفتی جامعہ مفتاح العلوم، مئو۔
۱۰۔ مولانا جمیل احمد صاحب نذیری، مفتی ونائب ناظم جامعہ عربیہ احیاءالعلوم مبارکپور۔
۱۱۔ مولانا خلیل الرحمان اعظمی عمری، ناظم جامعہ عربیہ دارالسلام عمرآباد تمل ناڈو
۱۲۔ مولانا محمد ایوب ندوی، جامعہ اسلامیہ بھٹکل (کرناٹک)
۱۳۔ مولانا زبیر احمد قاسمی، شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد۔
۱۴۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، صدر مدرس دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد
۱۵۔ مولانا محمد عبیداللہ اسعدی، استاذ حدیث جامعہ عربیہ ہتورا، باندہ۔
۱۶۔ مولانا ضیاءالدین اصلاحی، ناظم دارالمصنفین اعظم گڈھ۔
۱۷۔ مولانا عبداللہ طارق۔ (دہلی)
۱۸۔ مولانا محمد اسعد قاسمی، دارالعلوم اسلامیہ بستی (یوپی)
۱۹۔ مولانا معاذ الاسلام، استاذ مدرسہ امدادیہ مرادآباد (یوپی)
۲۰۔ مولانا محمد مصطفیٰ مفتاحی، مفتی دارالعلوم، راجستھان
۲۱۔ مولانا عبدالاحد ازہری، قاضی شریعت دارالقضاء مالیگاؤں۔
۲۲۔ مولانا سراج احمد صاحب، مفتی مدرسہ معہد ملت مالیگاؤں۔
۲۳۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم ماٹلی والا، گجرات۔
۲۴۔ مولانا عتیق احمد صاحب بستوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ
۲۵۔ مولانا محمد انیس الرحمان قاسمی، معاون قاضی شریعت امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ
۲۶۔ مولانا محمد مسعود عالم قاسمی، ناظم دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔
۲۷۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری، پروفیسر شعبۂ دینیات وسابق ڈین فیکلٹی دینیات
۲۸۔ مولانا نسیم احمد قاسمی، گول بازار، سرہا (نیپال)
۲۹۔ مولانا عزیزالرحمٰن فتحپوری، مفتی دارالعلوم امدادیہ بمبئی ۸۔
۳۰۔ مولانا فضیل الرحمان ہلال عثمانی، مفتی جامعہ دارالسلام مالیرکوٹلہ پنجاب
۳۱۔ مولانا نسیم احمد قاسمی مظفرپوری، "بحث ونظر" پھلواری شریف پٹنہ۔
۳۲۔ مولانا محمد زید صاحب، مفتی جامعہ عربیہ ہتورا، باندہ۔
۳۳۔ مولانا محمد جنید عالم ندوی قاسمی، مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ۔
۳۴۔ مولانا حبیب اللہ قاسمی، مفتی واستاذ حدیث مدرسہ ریاض العلوم گورینی جونپور
۳۵۔ مولانا مجاہدالاسلام القاسمی، قاضی شریعت دارالقضاء مرکزی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ وسکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی۔

نوٹ : مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ ندوۃ العلماء لکھنؤ کو دفعہ ۴، ۵ سے اتفاق نہیں ہے۔

علامہ عینیؒ کی حیات پر ایک نظر

مولوی محمد ظفر عالم ندوی، تخصص فی الفقہ

یوں تو اسلامی تاریخ کا ہر دور بلند پایہ شخصیات سے بھرا پڑا ہے اور ان کی خدمات سے روشن ہے، لیکن عہد صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد آٹھویں و نویں صدی کا زمانہ بہت ہی تابناک اور تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس دور میں بلند پایہ شخصیات اتنی بڑی تعداد میں پیدا ہوئیں اور انہوں نے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے، جن کا احاطہ کرنا بڑے سے بڑے مؤرخ کے لئے آسان نہیں، امام ابن تیمیہؒ ابن قیم جوزیؒ، حافظ ابن کثیرؒ، حافظ ابن حجرؒ، علامہ تفتازانیؒ، علامہ ابن خلدونؒ، علامہ سخاویؒ، علامہ شوکانیؒ، اور اس طرح کی بے شمار یکتائے روزگار شخصیات اسی دور کی یادگار ہیں، انہی نادر شخصیات میں علامہ بدر الدین عینیؒ بھی ہیں، جن کی شخصیت مختلف حیثیتوں سے قابل نمونہ اور لائق مطالعہ ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم انہی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔

نام و نسب

محمود نام، ابو الثناء، ابو محمود کنیت اور بدر الدین لقب تھا، عینیؔ سے مشہور ہیں، جو وطن کی طرف منسوب ہے، پورا نسب یہ ہے: محمود بن احمد بن موسیٰ بن احمد بن حسین، بن یوسف بن محمود۔[1]

وطن

تمام اصحاب سیر و تراجم کا اس پر اتفاق ہے کہ علامہ عینیؒ کا وطن "عینتاب" ہے، جو حلب سے تین مراحل پر ایک بڑا اور خوبصورت شہر ہے، جہاں ایک مستحکم قلعہ بھی ہے[2]۔ صاحب "تقویم البلدان" نے

---

(۱) الضوء اللامع، ج۱۰، ص۱۳۱، واعلام النبلاء ۲۵۵/۵، وحسن المحاضرۃ للسیوطی ۲۰۱/۱۔

(۲) معجم البلدان، ج ۲۵۳/۶۔

اس شہر کے متعلق مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "شہر عینتاب" ایک خوبصورت اور بڑا شہر ہے، جہاں چٹانوں کے درمیان بنا ہوا ایک مستحکم قلعہ بھی ہے، یہ شہر باغات اور نہروں سے معمور ہے، یہاں بڑے بڑے بازار ہیں اور یہ شہر حلب سے شمالی سمت تین مراحل پر واقع ہے"[1]۔

پیدائش

اسی "شہر عینتاب" میں جہاں بڑے بڑے علماء وفضلاء کی بڑی جماعت پیدا ہوئی، علامہ عینیؒ نے ۲۶ر رمضان المبارک ۷۶۲ھ میں اپنی زندگی کی پہلی سانس لی۔ ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں:
"مولدی فی السادس والعشرین من شہر رمضان سنة اثنتین وسبع مائة" (میری پیدائش ۲۶ر رمضان ۷۶۲ھ میں ہوئی) ——— حافظ ابن حجرؒ نے "المؤسس" میں لکھا ہے:
"محمود بن احمد العینتابی ذکر لی أنه ولد فی نصف رمضان سنة اثنتین وسبع مائة بحلب"[2]۔
(یعنی محمود بن احمد عینتابی نے مجھ سے خود بیان کیا ہے کہ وہ نصف رمضان ۷۶۲ھ میں حلب میں پیدا ہوئے) ——— شیخ عمر رضا کحالہ نے ذکر کیا ہے کہ: بدر الدین عینیؒ درب کیکن میں، ۱۷ر رمضان المبارک ۷۶۲ھ کو پیدا ہوئے اور عینتاب میں نشوونما پائی"[3] مولانا عبد الحی لکھنویؒ کا بیان ہے کہ: علامہ عینی رمضان ۷۶۲ھ میں مصر میں پیدا ہوئے"[4]۔

غرض کہ علامہ عینی کی تاریخ پیدائش اور جائے پیدائش کو تذکرہ نگاروں نے قدرے فرق کے ساتھ بیان کیا ہے ——— غور و تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بات وہی زیادہ صحیح ہے جو علامہ ابن حجرؒ نے "المجمع المؤسس" میں خود علامہ عینی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نصف رمضان (خواہ ۱۷ر ہو، یا اس سے کم و بیش) میں حلب میں پیدا ہوئے۔
والد چونکہ "عینتاب" کے قاضی ہوئے تھے۔ حلب سے عینتاب منتقل ہو گئے تھے، اس لئے بعض لوگوں نے

---

(۱) تقویم البلدان، ص ۲۶۹۔ (۲) المجمع المؤسس بحوالہ فوائد البہیہ۔ ص ۸۶
(۳) معجم المؤلفین، ج ۶، ص ۱۵۰۔
(۴) الفوائد البہیہ۔ ص ۸۶۔

عینتاب کی طرف منسوب کردیا۔ اس طرح یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ حلب میں پیدا ہوئے اور عینتاب میں نشوونما پائی۔

ابتدائی حالات

علامہ عینی کے ابتدائی حالات قابل نمونہ ہیں، انہوں نے بچپن ہی میں قرآن پاک حفظ کرلیا تھا، اس کے بعد مختلف علوم وفنون کی کتابیں زبانی یادکیں[1]۔ پھر تحصیل علم میں باضابطہ مشغول ہوگئے اور اپنے والد کے علاوہ عینتاب کے دیگر علماء سے کسب فیض کیا۔ چنانچہ شمس محمد الراعی سے صرف منطق اور عربی زبان دانی کی تحصیل کی، علم الفرائض علامہ بدر العینتابی سے حاصل کیا، مفصل اور توضیح کو ابن صالح بغدادی اور المصباح فی النحو کو خیرالدین قیصر سے پڑھا[2]۔ ان کے علاوہ شیخ میکائیل، حسام الرہادی ابن محمود السربادی اور دوسرے علماء ومشائخ وقت سے نحو وصرف منطق واصول اور معانی وبیان وغیرہ پڑھا[3]۔

علمی سفر

عینتاب کے مقامی علماء سے کسب فیض کے بعد آپ حلب کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں جمال الدین الملطی اور شیخ حیدر الرومی وغیرہ سے تفقہ حاصل کیا، اسی اثناء میں جب ۷۸۴ھ میں والد کا انتقال ہوگیا، گھر لوٹ آئے، پھر دوبارہ مختلف ملکوں کا سفر کیا اور ان کے علمی سرچشموں سے خوب سیراب ہوئے، چنانچہ بہسنا[4] میں شیخ ولی البہسنی، کختا[5] میں شیخ علاؤالدین اور ملطیہ[6] میں شیخ بدر الکشافی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔

---

(۱) البدر الطالع ۲/۲۹۴ (۲) الضوء اللامع ۱۰/۱۳۱

(۳) ایضاً (۴) بہسنا: یہ نہروں اور باغات سے معمور ایک خوبصورت اور وسیع شہر ہے، اس کے شمال مغرب میں تقریباً دو دن کی مسافت پر عینتاب واقع ہے (تقویم البلدان، ص ۲۶۵) قاضی ابن شحنہ نے لکھا ہے، یہ شہر آرمینیوں اور مسلمانوں کی آبادی پر مشتمل ہے (الدر المنتخب، ص ۱۷۱)۔ (باقی حاشیہ دوسرے صفحہ پر)

بیت اللہ اور بیت المقدس کی زیارت اور علمی استفادہ

حصولِ تعلیم کے بعد علامہ عینی نے بیت اللہ کی زیارت کی اور حج سے مشرف ہوئے، پھر بیت المقدس کی زیارت کو تشریف لے گئے، وہاں خوش قسمتی سے علامہ سیرامی سے ملاقات ہوگئی، جو خود بھی قدس کی زیارت کے لئے تشریف لائے تھے، علامہ عینیؒ ان کے تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سیرامی کی مستقل صحبت اختیار کرلی اور انہی کے ہمراہ ۷۸۸ھ میں قاہرہ تشریف لائے اور مدرسہ ظاہریہ میں قیام کیا، علامہ سیرامی نے علامہ عینی کو اسی خانقاہ میں تدریس پر مامور کردیا، جہاں وہ علامہ سیرامی کی وفات ۷۹۰ھ تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے۔

درس وافادہ

اپنے شیخ کی وفات کے بعد علامہ عینیؒ نے مصر ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی، بعض حاسدوں کی شکایت پر امیر آخور نے آپ کو برقوقیہ کی خدمت سے علاحدہ کرکے مصر سے نکل جانے کا حکم دیا، لیکن شیخ الاسلام سراج الدین البلقینی نے درمیان میں پڑ کر صلح وصفائی کرادی اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

درس گاہ محمودیہ میں ایک عرصہ تک درس دیا اور مؤید کے زمانہ میں خانقاہ مؤیدیہ میں بہت دنوں تک قال اللہ اور قال الرسولؐ کے نغمے سنائے[1]۔ قیام مصر کے زمانہ میں دور دراز ممالک کے تشنگانِ علم آپ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے ہیں، مختلف ممالک کے ائمہ آپ کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ حافظ سخاوی کا بیان ہے: وأخذ عنه الائمة من كل مذهب طبقة

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ: (۵) کختا: یہ شہر حلب کے مضافات میں خوب صورت مقام میں شمار کیا جاتا ہے، جہاں ایک مستحکم قلعہ بھی پایا جاتا ہے، ان دنوں بڑے شہروں میں اس کا شمار ہے (الدر المنتخب ص ۲۴۳)۔ (۶) ملطیہ: بلاد روم کا ایک مشہور شہر ہے جسے اسکندر نے بسایا تھا وہاں کی شہرۂ آفاق جامع مسجد صحابۂ کرامؓ نے تعمیر کی تھی، ملطیہ کی جانب رواۃ ومحدثین کی ایک بڑی تعداد منسوب ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑا مردم خیز خطہ تھا (معجم البلدان ۸/۲۶۵) (۱) روضات الجنات ج ۴ ص ۲۱۵، الضوء اللامع ج ۱۰ ص ۱۳۲، شذرات الذہب ج ۷، ص ۲۸۷۔

بعد أخرى بل اخذ عنه طبقة اهل الطبقة الثالثة وكنت عن قرأ عليه اشياء" (ان سے ہر مسلک و مذہب کے ائمہ نے علم حاصل کیا اور میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے ان کے سامنے بہت سی چیزیں پڑھیں) ـــــــــــ حافظ ابن حجرؒ نے بھی آپ سے تین احادیث کی سماعت کی تھی، علامہ عینیؒ نے اپنی قیام گاہ کے پاس جامع ازہر کے قریب ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا اور اس پر اپنا قیمتی کتب خانہ وقف کیا تھا[1]۔ صاحبِ معجم نے اس مدرسہ کا نام بدریہ لکھا ہے، جو کہ ایک محلہ میں علامہ کے مکان کے بالمقابل واقع تھا[2]۔ اس زمانہ میں آپ کے تبحر علمی کی شہرت چار دانگِ عالم میں پھیل گئی تھی، اور ہر سمت سے طالبانِ علوم نبوت کا ہجوم استفادہ کے لئے امنڈ پڑا، ابن حماد حنبلیؒ نے لکھا ہے: اشتهر أسمه وبعد صيته وافتى ودرس حتى انه من أعيان الفقهاء الحنفية[3]۔

تبحر علمی اور جامعیت

آپ کو جملہ فنون میں پوری مہارت حاصل تھی، آپ کے تلمیذ رشید ابن تغری بردی نے جو خود ایک ممتاز اور مامور شیخ تھے، آپ کے تبحر علمی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے: "آپ مختلف علوم و فنون میں ماہر تھے، قانون داں، فقیہ اور اصولی تھے، نحو و صرف اور لغت عرب میں پوری دست رس رکھتے تھے، تاریخ اور معقولات و منقولات کے جامع تھے، بلکہ یوں کہا جائے کہ کوئی بھی ایسا علم نہ تھا، جو ان میں جمع نہ ہو[4]۔" ـــــــــــ علامہ سخاوی لکھتے ہیں: "آپ امام تھے، عالم تھے نحو و صرف اور عربیت کے ماہر تھے، تاریخ کے حافظ اور دیگر علوم و فنون میں ید طولیٰ رکھتے تھے[5]۔" مولانا عبدالحی لکھنویؒ تحریر فرماتے ہیں: "آپ کو تخریج احادیث اور ان کے معانی کی تشریح میں بڑا کمال حاصل تھا اور مختلف علوم و فنون میں ان کی نظر بہت وسیع تھی[6]۔"

---

(۱) روضات الجنات، ج ۴، ص ۲۱۵۔
(۲) معجم المطبوعات، ج ۲، ص ۱۳۰۳۔
(۳) شذرات الذهب ۲۸۷/۷۔
(۴) المنهل الصافي، بحواله اعلام النبلاء، ج ۵، ص ۲۵۸۔
(۵) الضوء اللامع، ج ۱۰، ۱۳۲۔
(۶) الفوائد البهية - ۸۴۔

سرعت کتابت اور عربی و ترکی زبان پر مہارت

علامہ عینی علمی کمالات کے ساتھ اور دیگر کمالات کے بھی حامل تھے، وہ بڑے زود قلم تھے، سرعتِ کتابت میں کوئی ان کی نظیر نہیں تھی۔ حافظ ابن حجرؒ کے متعلق منقول ہے کہ بہت زود قلم تھے، لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ حافظ ابن حجرؒ تیز لکھتے تھے، لیکن خط صاف نہ تھا، ان کی تحریر مشکل سے پڑھی جاتی تھی۔ مگر علامہ عینی سرعتِ کتابت کے ساتھ بہت خوش نویس تھے، علامہ سخاویؒ عینیؒ کی سرعت کتابت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ——— "انہوں نے ایک رات میں "قدوری" لکھی تھی"[1] ——— ابن تغری بردی جنہیں علامہ عینیؒ سے خصوصی تلمذ کا شرف حاصل تھا رقمطراز ہیں: ——— "آپ بہت خوش خط لکھنے والے اور زود قلم تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے ایک رات میں کتاب "قدوری" لکھی تھی۔ اور اس کے مسودات مبیضات کی صورت میں موجود ہیں"[2] ——— مؤرخ مقریزی کا بیان ہے: علامہ عینیؒ نے ایک رات میں کتاب "الحاوی" تحریر فرمادی"[3]

اسی طرح علامہ عینی کا ایک کمال یہ تھا کہ عربی کے علاوہ ترکی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے، ملک اشرف برسبای جو آپ کا بے حد معتقد تھا، کا بیان ہے کہ: ——— "عینی اپنی کتاب "التاریخ" عربی میں پڑھتے جاتے تھے اور ترکی زبان میں اس کی شرح بیان کرتے جاتے تھے"[4]

امراء و سلاطین سے تعلق

علامہ عینیؒ کو اپنے وقت کے تقریباً تمام امراء اور اعیان سلطنت سے خصوصی تعلق تھا، امراء آپ سے تعلق کو باعثِ افتخار تصور کرتے تھے، گو اس دور کے ارباب دعوت و عزیمت اور علماء و فضلاء کی ایک بڑی جماعت نے اعیانِ حکومت سے بے تعلقی و بے اعتنائی کی ایسی شاندار

---

(۱) الضوء اللامع، ج ۱ ص ۱۳۲۔ (۲) المنہل الصافی بحوالہ اعلام النبلاء، ج ۵، ص ۲۵۹۔

(۳) الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۱۳۳۔

(۴) ایضاً۔

مثالیں قائم کی ہیں، جو ہر زمانہ میں دلیلِ راہ کا کام دیتی ہیں۔ لیکن عینیؒ کا بڑا کمال ہے کہ انہوں نے قعرِ دریا میں رہ کر نہ صرف اپنے دامن کو تر ہونے سے محفوظ رکھا، بلکہ ان اعیانِ حکومت کی اصلاح کی کامیاب کوششیں کیں، لیکن عینی کا امراء سے تعلق دین کے لئے تھا، چنانچہ ملک اشرف کو جو آپ سے خصوصی تعلق رکھتا تھا، دین کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے، خود ملک اشرف کو اس کا اعتراف تھا کہ: لولاہ لکان فی اسلامنا شیئ[1] ـــــ یعنی اگر عینی نہ ہوتے تو ہم لوگ پورے مسلمان نہ ہوتے ـــــ ابن تغری بردی رقمطراز ہیں: ـــــ ملک اشرف علامہ عینیؒ سے دین اور عبادات و معاملات کی وہ باتیں دریافت کرتے رہتے تھے، جن کی ضرورت پیش آتی رہتی اور علامہ عینی بہتر انداز میں جواب دیتے رہتے تھے، یہاں تک کہ میں نے سنا ہے، کہ ملک اشرف کبھی کبھی یہ اعتراف کرتے رہتے تھے کہ "اگر عینی نہ ہوتے تو ہم لوگ مسلمان نہ ہوتے"[2] اس بیان سے اس بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ علامہ عینی کے روابط شاہانِ وقت سے دینی فوائد سے خالی نہ تھے، حکمرانوں کی دینی اصلاح ہوتی تھی اور امور حکومت امور شریعت کے مطابق چلتی تھی اس طرح علامہ عینی کی ذات درحقیقت "جام شریعت" اور "سندانِ عشق" کی جامع تھی۔

منصب قضا کے صدر نشیں

حکومتِ ناصریہ کے حکمرانوں میں ملک اشرف کو آپ سے بڑی عقیدت تھی، اور کافی استفادہ بھی کیا تھا، اس بنا پر اس نے آپ کو اوقاف کا نگراں بنانا چاہا، لیکن علامہ عینیؒ نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر ۸۲۹ھ میں بڑے اصرار کے بعد قاضی زین الدین التفہنی کی جگہ مصر کے حنفی قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کیا۔[3] چار سال تک منصبِ قضاء کے فرائض ادا کرنے

---

(۱) الضوء اللامع، ج ۱۰۔ ص ۱۳۳۔

(۲) اعلام النبلاء، ج ۵۔ ص ۲۵۶۔

(۳) الضوء اللامع، ج ۱۰۔ ص ۱۳۴۔

کے بعد اس سے علیحدگی اختیار کرلی اور ۳۰ صفر ۸۳۳ھ میں قاضی تفہنی دوبارہ مسند نشین ہوئے، پھر ۸۳۵ھ میں تفہنی کے مرض الموت میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے اس منصب پر دوبارہ آپ کا تقرر ہوا[1]۔ اسی اثناء میں ملک اشرف کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا لڑکا ملک عزیز یوسف تخت نشین ہوا، وہ بھی اپنے باپ کی طرح بڑا لائق، دیندار اور علامہ عینیؒ کے کمالات کا معترف تھا اس لئے اس کے عہد میں ایک عرصہ تک قاضی القضاۃ کے منصب پر برقرار رہے، لیکن پھر ملک عزیز کے مشیر کار اور امورِ مملکت کے نگراں جقمق علائی نے محرم ۸۴۲ھ میں آپ کو معزول کر کے شیخ الاسلام سعدالدین الدیری کو آپ کی جگہ پر قاضی القضاۃ مقرر کیا[2]۔

محکمۂ احتساب کے مسند نشین

علامہ عینیؒ حکومت کے مختلف عہدوں اور منصبوں پر فائز رہے، چنانچہ ملک برقوق کے انتقال کے بعد شیخ مقریزی کی جگہ قاہرہ کے محکمہ احتساب کے مسند نشیں ہوئے، مگر اس منصب پر ایک سال سے زائد نہ رہے اور ۸۰۲ھ میں مقریزی کے لئے جگہ خالی کر کے علاحدہ ہو گئے، اس کے بعد مختلف سالوں میں کئی مرتبہ عینی کا تقرر اس منصب پر ہوا۔ ابن تغری بردی نے لکھا ہے: "آپ قاہرہ کے منصب احتساب پر کئی مرتبہ فائز ہوئے، پھر علاحدہ ہوئے[3]۔"

جیل خانوں کے نگراں

سلطان مؤید کو آپ سے بڑی عقیدت تھی، اس لئے انہوں نے آپ کو مختلف عہدوں پر مامور کیا، اور آپ پر بڑا اعتماد تھا، اسی لئے اس نے آپ کو ایک مرتبہ بلادِ روم میں اپنا قاصد بنا کر بھیجا تھا، ان سب کے علاوہ آپ کو جیل خانوں کا نگراں بنایا اور آپ اس عہدہ پر قائم رہے[4]۔

---

(۱) حسن المحاضرہ، ج ۲، ص ۱۱۰۔ (۲) اعلام النبلاء، ج ۵/ ۲۵۶۔
(۳) المنہل الصافی، بحوالہ اعلام النبلاء، ج ۵، ص ۲۵۶۔ (۴) الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۱۳۴۔

مسند حدیث وفقہ کے صدر نشین

علامہ عینیؒ حکومت ناصریہ کے زمانہ میں مختلف عہدوں پر فائز ہوئے، اسی زمانہ میں درسگاہ محمودیہ میں فقہ کا درس دیا، سلطان مؤید کے زمانہ میں جس کے آپ خصوصی ہم جلیس تھے، اس نے آپ کو درسگاہ مؤیدیہ کے مسند حدیث پر بٹھایا، جہاں آپ نے طویل عرصہ تک درس حدیث کا فریضہ انجام دیا۔[1]

بیک وقت مختلف منصبوں پر فائز

علامہ عینیؒ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ بیک وقت کئی عہدوں پر فائز رہے، چنانچہ ملک اشرف کے زمانہ میں قاہرہ کے محکمۂ احتساب اور جیل کی نگرانی کی خدمت بھی ایک عرصہ تک انجام دی، ساتھ ساتھ منصب قضاء کے فرائض بھی انجام دیتے رہے، علامہ عینیؒ کے علاوہ غالباً کوئی بھی اس زمانہ میں اتنے عہدوں پر بیک وقت مامور نہیں تھے۔ حافظ سخاوی عینیؒ کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ولم یجتمع القضاء والحسبة ونظر الأحباس فی آن واحد لأحد قبلہ۔[2] یعنی منصب قضاء محکمۂ احتساب اور جیل کی نگرانی، بیک وقت اس سے پہلے کسی کے حصہ میں نہیں آئی۔

وفات

علامہ عینیؒ اب زندگی کے آخری مرحلہ پر پہونچ چکے تھے، انہوں نے نصف صدی سے زیادہ علم و عمل اور فہم و دانش کے چراغ روشن کئے، عہدۂ قضاء سے آخری بار علیحدگی کے بعد وہ خلوت گزیں ہو گئے اور اپنے مکان پر تصنیف و تالیف کے مشغلہ میں لگے رہے، یہاں تک کہ ۴ ذی الحجہ یوم سہ شنبہ ۸۵۵ھ کو علم و عمل کا یہ خورشید درخشاں پون صدی سے زائد دنیائے علم پر ضیا پاشی کرنے کے بعد غروب ہو گیا، دوسرے دن جامع ازہر میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور قاہرہ میں اپنے قائم کردہ مدرسہ میں مدفون ہوئے۔[3]

---

(۱) اعلام النبلاء، ج ۵، ص ۲۵۸۔ (۲) الضوء اللامع، ج ۱۰، ص ۱۳۳۔ (۳) حوالۂ سابق۔

مولانا غلام محمد صاحب (پاکستان)
(مجاز حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ)

اسلام کا نظام روحانی

اسلام میں جہاں اعمال کی ظاہری صورت مقصود ہے، وہیں انکی باطنی کیفیت بھی مطلوب ہے، اسی کا نام تصوف یا طریقت ہے، ہر چند کہ تصوف کا تعلق علم سے زیادہ عمل اور پڑھنے سے زیادہ برتنے سے ہے، تاہم فاضل مقالہ نگار جو خود اس میکدہ کے مئے خوار ہیں نے نہایت فاضلانہ طریقہ پر اسکی حقیقت اس مقالہ میں واضح کیا ہے۔ (ادارہ)

سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۷۲ میں ایک حقیقت امری کی نشاندہی یوں فرمائی گئی ہے:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۚ قَالُوْا بَلٰی ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝

جب کہ (اے محمدؐ) آپؐ کے ربّ نے اولادِ آدمؑ کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا اور ان سے انہی کے متعلق اقرار لیا، کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا، کیوں نہیں، ہم سب گواہ ہیں۔ کبھی کہنے لگو قیامت کے دن کہ ہم تو اس سے محض بے خبر تھے!

بقول حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ "یہ تخمِ ہدایت کی وہ کاشت تھی جسے کل آسمانی تعلیمات کے مبدا، و منتہا کا وجودِ مجمل کہنا چاہیے، اس کو عام فیاضی کے ساتھ نوعِ انسانی کے عام افراد میں بکھیر دیا گیا، تاکہ آئندہ ہر آدمی وحیِ الٰہی اور الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان و توحید کے درجہ تک پہونچا سکے"[1]

---

(۱) تفسیری حواشی بر ترجمہ شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔

قرآن نے عہد الست کا ذکر کیا ہی اسلیئے، تاکہ انسان اس کو خوب یاد رکھے، اس کو اپنی راہِ حیات کا چراغ، اپنی منزل کا نشان اور اپنے ہر کار و عمل کا مرکز و محور بنائے، اس کی یاد تازہ ہے تو عرفانِ نفس بھی حاصل ہے اور عرفانِ رب بھی، اس کی یاد ہمارا ہوش اور اس کی فراموشی ہماری بے ہوشی ہے۔ غور کیجیئے کہ اسی عہد سے ہمیں پتہ چلا کہ:

(۱) ہماری اصل یا ہمارا وجود عبارت ہے روح سے۔

(۲) ہمارا وطن عالم ارواح ہے، جو ہماری ناسوتی حیات کی نسبت سے آخرت ہے۔

(۳) ہماری منزل قربتِ الٰہی اور ہمارا آبِ حیات مشاہدۂ ربانی ہے۔

(۴) ہمارا خمیر عشقِ الٰہی سے اٹھایا گیا ہے (یحبھم و یحبونہٗ) محبت الٰہی کے بغیر ہماری زندگی لفظِ بے معنیٰ اور ذکر الٰہی کے بغیر ہمیں چین میسر نہیں آسکتا (الا بذکر اللہ تطمئن القلوب)

(۵) ہمارے سفر کا مبداء و معاد یا مصدر و مرجع "الست و بلیٰ" والا نقطہ ہے، یہی انا للہ و انا الیہ راجعون کا حاصل بھی ہے، اور عارف رومی نے اسی کی ترجمانی کی ہے، ؎

هر کسے کو دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید روزگارِ وصلِ خویش

(۶) عہد الست ہی کے ذریعہ انسان توحید کا دوامًا مکلف بنا، اگر یوم الست مکلف نہ بنتا تو اس دنیا میں آکر اس کا مامور بہ توحید رہنا ناممکن ہو جاتا اور جب الوہیت کا اقرار نہ ہو سکتا تو دنیوی اعمال پر جزاء و سزا، بلکہ فی نفسہٖ خیر و شر کی واقعی تمیز تصور سے باہر رہتی۔[1]

مذکورہ بالا حقائق سے معلوم ہوا کہ جب تک عہد الست ہمارے انفرادی و اجتماعی، دنیوی و اخروی اعمال کا مرکز و محور ہے، اس وقت تک ہم عبد اللہ، خلیفۃ اللہ اور ولی اللہ ہیں۔

---

(۱) تفسیر بیان القرآن، از حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ۔

اور جہاں اس محور سے ہٹے اور جب تک ہٹے رہے، ہم شرفِ انسانی سے گر گر کہیں کے نہ رہے، کالانعام بل ھم اضل۔ کا مصداق بن گئے۔

ع: ہشدار کہ راہِ خود گم نہ کنی

ان حقائق کو سمجھ کر اب آئیے روح کے سفر ناسوتی کا جائزہ لیں، انسانِ اوّل یعنی حضرت آدم علیہ السلام جب وطن اصلی سے نکل کر اس زمین پر اترآئے، چونکہ وہ انسانِ اوّل کے ساتھ ساتھ نبی اوّل بھی تھے، ان کی روح مزکّیٰ اور ان کا قلب مصفّیٰ تھا، اسلئے مادی حجابات ان کیلئے شفاف شیشے تھے، وہ مہجور وطن ہو کر بھی وطنی لذتوں سے سرشار تھے، قربِ الٰہی بھی حاصل تھا، اور مکالمۂ ربانی سے بھی مشرف تھے، مگر ان کی ذریت جو پھیلی اور پھیلتی چلی گئی، وہ ناسوتی حجابات میں آکر اپنے وطن، وطن کی بہار، اپنی تخلیقی غایت، اپنے سفرِ حیات کے آغاز و انجام کو یکسر بھلا بیٹھی، علم سے عاری ہو کر جہل میں اور عرفان سے محروم ہو کر فریب نظری میں مبتلا ہو گئی، آدم زادوں کو ان ظلماتِ عارض سے نکال کر الست کا سبق یاد دلائے اور حقائق الست کو ان پر بے نقاب کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ہادیان برحق بھیجے اور بالآخر خاتم النبیین سرکارِ رسل محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ازلی کے اکمال و اتمام کے لئے مبعوث فرمایا۔ وہ تشریف لائے اور حیات کے دھارے پر آنکھیں بند کئے بہی جانے والی انسانیت کو چونکایا، حیات کی اس عارضی موڑ پر جس کا نام "دنیا" ہے رہنے اور گذر جانے کا ڈھنگ سکھایا، اپنی ذات اور اپنے طرزِ حیات کو گواہ ٹھہرا کر انہیں سفر آخرت کا شعور بخشا، فرمایا:

مالی وللدنیا ما انا فی الدنیا الاکراکب استظل تحت شجرۃ ثم راح و ترکھا۔	مجھے دنیا (کی لذتوں، راحتوں) سے کیا سروکار، دنیا میں میری مثال اس سوار مسافر کی سی ہے جو سایۂ شجر میں سستائے ... ... اور چلتا بنے۔

اور حکماً فرمایا،

کن فی الدنیا کانک غریب او عابر سبیل۔	دنیوی زندگی تو بس اجنبیانہ اور مسافرانہ طور پر بسر کرو!

یہ اپنی طرف سے فرمایا اور اس کی دالہٰی تنبیہات بھی سنائیں، مثلاً فرمایا کہ دیکھو

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَۃَ وَسَعٰی لَہَا سَعْیَہَا — جس نے (ہر اقدام میں) آخرت کی نیت رکھی اور اس کے لئے

فَاُولٰٓئِکَ کَانَ سَعْیُہُمْ مَّشْکُوْرًا ۝ — کوشش کی، جیسا کوشش کا حق ہے اور وہ مومن ہو تو

(الاسراء - ۱۹) — ایسے ہی لوگوں کی مساعی نگاہِ حق میں قابلِ قدر ٹھہریں گی۔

غور کیجئے کہ یہی سفرِ آخرت کا ہمہ وقتی شعور ہے، جو مسلمان کے زہد، ورع، تقویٰ، مصیبت میں صبر، راحت میں شکر، فقر میں شاہی اور شاہی میں فقر و بے نیازی کا ضامن ہے، کیونکہ منزل دوست مسافر کی نظر راستہ کی تکلیف و راحت پر کب ہوتی ہے، بقول ہمارے شیخ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ؎

ہم ایسے رہے یاں کہ ویسے رہے — وہاں دیکھنا ہے کہ کیسے رہے
حیاتِ دو روزہ کا کیا عیش و غم — سفر کا بھی کیا جیسے تیسے رہے

اس مرحلہ پر اس فرقِ منازل کو بھی ذہن میں لائیے کہ انسان یا تو اپنے وطن میں صرف مشاہدۂ ربانی میں مگن تھا، یا تاریک دنیا میں آکر "مجاہدہ" کا پابند کر دیا گیا، امتحان میں ڈالا گیا:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ — اسی نے موت و حیات پیدا کی، تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے

لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝ (الملک ۲) — کون بہتر عمل کرتا ہے۔

جہاں روشنی تھی مطالبۂ عمل نہ تھا، جب تاریکی میں گھر گئے تو مجاہدہ واجب ٹھہرا، اب بے بصر و بے خبر انسان منزل کی طرف چلے تو کیونکر چلے، اس کی اسی ہدایت کے لئے قرآن پاک اتارا گیا، جو فرقان ہے، کہ حق کو حق، باطل کو باطل دکھلا دیتا ہے، جو نور ہے کہ راہِ آخرت کو روشن کرتا ہے، جو شفاء ہے کہ نفس کے روگ کو دور کر کے اس کے ذائقہ کو درست کرتا اور قلب کے زنگ کو چھڑا کر معرفتِ حق کے قابل بناتا ہے، جو رحمت ہے کہ دنیا کی ہر زحمت کو راحت سے بدل دیتا ہے، جو ہدیٰ ہے کہ بچھڑے ہوئے انسان کو پھر اپنے مولیٰ سے ملا دیتا ہے، مگر غور کی بات یہ ہے کہ یہ ربانی نظامِ حیات اور یہ کلام اللہ اترا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلبِ اطہر ہی پر تھا اور وہیں جمع ہو کر جب نطقِ نبوی سے اس کا اظہار انسانیت پر ہوا تو بظاہر انسان کا کان

اس کو سن رہا تھا، مگر اس کا اثر صرف وہیں ہو رہا تھا جہاں اثر پذیر دل موجود تھا، خود قرآن کہہ رہا ہے:

لِمَنْ كَانَ لَهُ قَلْبٌ ○ (ق - ۳۷) ہر اس شخص کے لئے جو دل رکھتا ہو۔

یہ کیوں؟ اس کا جواب عالم ربانی علامہ ابن قیم یہ دیتے ہیں کہ:

فصاحب القلب الحی بین قلبہ وبین معانی القرآن اتم الاتصال ○ — اس لئے کہ زندہ قلب والے کے قلب اور قرآنی معانی میں اتصالِ اتم پایا جاتا ہے!

اور فرماتے ہیں کہ یہاں آیت پاک میں قلب سے مراد "قلبِ بیدار" ہی ہے، نہ کہ دلِ مردہ۔

والمراد بہ القلب الحی الذی یعقل عن اللہ، کما قال اللہ تعالیٰ ان ھو الا ذکر وقرآن مبین لینذر من کان حیا۔ ای حی القلب[1] — اور یہاں قلب سے مراد زندہ قلب ہے، جو اللہ کی معرفت رکھتا ہو، جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا ہے "یہ تو خالص نصیحت اور صاف پڑھی جانے والی کتاب ہے تاکہ ہر اس شخص کو ڈرائے جو زندہ ہو۔ یعنی زندہ دل رکھنے والا ہو۔

معلوم ہوا کہ اصلاً اور آخر کار ہدایت پذیری کا تعلق قلبِ انسانی سے ہے، جو اس دنیا میں روح کی آنکھ اور اس کا حاسۂ ادراک ہے ـــــ ثانوی طور پر البتہ اسی آیت میں اثر پذیری کی ایک صورت یہ تبلائی گئی ہے:

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ (ق - ۳۷) یا جو کان دھر کر توجہ سے سنے۔

یہاں کان اور دھیان قلب تک ہدایت رسانی کے وسائل قرار دئے گئے ہیں، باقی حیات اور ہدایت پذیری تمام تر قلب ہی سے متعلق ہے۔ اسی لئے ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الا ان فی الجسد لمضغۃ اذا صلحت — سن رکھو کہ انسانی جسم میں ایک لوتھڑا ہے، جب وہ

---

(۱) التفسیر القیم، مرتبہ مولانا محمد ادریس ندوی نگرامی رح

صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ اَلا وھی القلب۔ سدھر جاتا ہے تو سارا جسم سدھر جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ قلب ہے۔

اسی قلب کو تقوے کا مرکز بھی بتلایا، اس طرح کہ اپنے دستِ مبارک سے اپنے قلبِ اطہر کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "والتقویٰ ھٰھنا" (تقویٰ کی جگہ یہ ہے)

بہتر سے بہتر ضابطۂ حیات انسان کو انسانِ کامل نہیں بنا سکتا، جب تک کہ اس کی تنفیذ میں اندر سے باہر، قلب سے جوارح، نیت سے عمل، شعورِ داخلی سے ثبوتِ خارجی اور فرد سے اجتماع کی طرف کا اصول نہ برتا جائے، یہی تمام ہادیانِ برحق اور خود ہادیٔ اعظم و خاتم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت و تبلیغ کا اصول رہا اور اسی کی پیروی ہم پر لازم قرار دی گئی۔

اب آئیے ایک اور حقیقت پر غور کریں، عالمِ ارواح میں گو ہم قیدِ زمان و مکان سے باہر نہیں تھے۔ مگر وہ زمانِ الٰہی سے الگ ایک زمان غیر زمانی اور مکان نامتناہی تھا، نہ یہ شکلیں تھیں نہ صورتیں، نہ وہاں ماضی، حال و مستقبل تھا۔ علمی مشاہدہ تھا، مگر بلا صورتِ عمل کے، مکالمہ تھا، مگر بلا لسان و صوت کے، مگر سفرِ حیات کی ناسوتی منزل میں پہونچکر روح پابندِ جسم ہو کر اعمال کی صورتوں کے تعیین پر مجبور ہو گئی، یہاں تک کہ وہ اعمال جن کو اسلام اعمالِ صالحہ قرار دیتا ہے، وہ بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہ سکے، گو مقصودِ اصلی ان کی حقیقت یا روح ہی رہی، مگر چونکہ اس عالم میں کوئی روح بلا قالب پائی نہیں جا سکتی، اس لئے وہ قالب بھی مطلوب ہو گئے، استاذِ فلسفہ صوفی صافی بزرگ حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ فرماتے ہیں:

"بات یہ ہے کہ کسی شئے کے کمال کا تعلق ہمیشہ اس کے ظاہر سے زیادہ باطن، کم سے زیادہ کیف، قشر سے زیادہ مغز، یا جسم سے زیادہ جان اور صورت سے زیادہ معنیٰ سے ہوتا ہے ...... جس طرح "انسانِ کامل" کے دو رخ ہیں، ظاہر و باطن، یا قلب و قالب، اسی طرح "دینِ کامل" کے بھی دو رخ ہیں، شریعت و طریقت، اور جس طرح شریعت نام ہے ظاہر یا قالب کے اعمال و احکام کا، اسی طرح طریقت یا تصوف نام ہے باطن یا قلب کے اعمال و احکام کا، دوسرے لفظوں

میں یا یہ کہو کہ تصوف نام ہے باطن کی فقہ کا، جس طرح نماز روزہ وغیرہ ارکان کی ایک ظاہری صورت ہے، جس کے احکام فقہ میں بیان ہوئے ہیں، اسی طرح خشوع و خضوع حضورِ قلب، یا دل سے حق تعالیٰ کی یاد و ذکر (اقم الصلوٰۃ لذکری)، قلب و باطن کے اعمال ہیں، جس طرح اکل و شرب، روزہ کا ظاہر ہے، اسی طرح اس کا باطن (لعلکم تتقون) ہے، پھر جس طرح مختلف اعمالِ شرعیہ اپنی اپنی قالبی صورت رکھتے ہیں، اسی طرح ان سب کی صحت و سقم، قبول و عدم قبول کا مدار قلبی نیتوں، (الاعمال بالنیات) اور درجاتِ اخلاص پر ہے، سب سے بڑھ کر ایمان اور عقائد، جن پر نجات اور ظاہر و جوارح کے سارے اعمال کی صحت و قبولیت کا مدار ہے اور جن کے بغیر نہ نماز نماز ہے نہ روزہ روزہ، وہ بالکلیہ یقین و اذعان کے قلبی و باطنی فعل ہی کا نام ہیں[۱]"۔

غرض عالم ناسوت میں ہمارا وجود جس طرح روح مع الجسد کا نام ہے، اسی طرح یہاں ہمارے اعمال کا اعتبار بھی مخصوص معنویتوں کے ان کے مخصوص اشکال کے ساتھ جمع ہوتے ہی میں متصور ہو سکتا ہے، اسی نکتہ کو نہ سمجھنے سے مسلمانوں میں اہل ظاہر اور اہلِ باطن کے دو گروہ پیدا ہوئے اور دونوں حقیقت سے بے گانہ رہے، شیخ الشیوخ حضرتِ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

"عبادت کی روح محبت و عشق — یہ سب جب پایا جائے گا، کسی نہ کسی شخص کے ساتھ پایا جائے گا، کیونکہ "مطلق من حیث ہو" مطلق نہیں پایا جا سکتا، کلّی مرتبہ کلّی میں نہیں پائی جا سکتی، جس طرح کہ انسان جب پایا جائے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جائے گا۔ اب ہم دیکھتے ہیں روحِ عمل، یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں، وہ اس شخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلا واسطہ کسی عملِ ظاہری کے ہو، کیونکہ اس میں کوئی مشقت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں، بلکہ مطلوب خاص وہ افراد

---

[۱] تجدید تصوف (مطبوعہ لکھنؤ) ص ۳۴ تا ۳۶۔

ہیں جو ضمن میں کسی عملِ ظاہری کے ہوں، پس اگر کوئی عملِ ظاہری نہیں تو وہ شخص نہیں، اور کلّی من حیث ہو، کلّی کا وجود ہوتا نہیں، پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی۔ اور اگر کوئی عملِ ظاہری کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوئی، تو اے مدعی وہی صورت کیوں قبول نہیں کرتا جو محبوب نے تجویز کی ہے، جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزۂ محبوب سے اچھی کون سی صورت ہو گی؟"(۱)

ایک اور موقع پر فرمایا:

اس بات سے کوئی مسلمان انکار کر سکتا ہے کہ جس طرح اعمالِ ظاہرہ حکم خداوندی ہیں، اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکم الٰہی ہیں، کیا "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ" امر کا صیغہ ہے اور "اصبروا، واشکروا" امر کا صیغہ نہیں؟ کیا "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے، اور "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" سے محبت الٰہی کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں؟ بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں، اور باطن کی صفائی مقصود و موجبِ نجات اور اس کی کدورت موجبِ ہلاکت ہے۔

قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا (الشمس-۹)	بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو میلا کیا، ناکام رہا۔
یوم لا ینفع مال ولا بنون الا من اتی اللہ بقلب سلیم (الشعراء، ۸۸)	جس دن مال اور اولاد کام نہ آئیں گے، بجز اس کے کہ جو شخص اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کر آئے۔

دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلامتیِ قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا ہے"(۲)

غرض اس جمع اضداد دنیا میں اگر حیاتِ انسانی کو عام حیاتی سطح سے جو دراصل "سطحِ حیوانی" ہے، ایمانی سطح پر لانے کے لئے جو دراصل "سطحِ روحانی" ہے، یا یوں کہیے، آلودہ زندگی کو "حیاتِ طیبہ"

---

(۱) وعظ مسمّٰی بہ "روح الارواح" (۲) رسالہ "حقیقتِ تصوف" حضرت تھانوی۔

والی منزل میں پہونچانے کے لئے ضروری ہے کہ معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ یک وقت صورت اعمال بھی حاصل کی جائے اور روح اعمال بھی جذب کی جائے۔ صورت اعمال تو قرآنی وحدیثی صراحتوں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نمونۂ اعمال سے ملیں گی، جس کا درس ہر عالم دین سے مل سکتا ہے البتہ روحِ اعمال جو بذریعہ صحبت منجذب ہو کر منتقل ہوتی آرہی ہے اور کسی مستند صحبت یافتہ اور مجاز صحبت بزرگ ہی سے بطریق انجذاب حاصل کی جا سکتی، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک لاکھ سے زائد دور نبوی کے مسلمانوں کا سب سے بڑا شرف "صحابیت" ہی ہے اور اس شرف میں اس طبقۂ مقدس کے عالم و عامی، شمشیر زن اور شاعر، صفہ نشیں اور صاحبِ خلافت سب برابر ہیں، اسی فیضانِ صحبتِ نبوی نے انہیں "احسان" کے مرتبۂ اعلیٰ تک پہنچایا تھا ذات حق اور جنّت و دوزخ گویا ان کی کھلی آنکھوں کے سامنے آگئے تھے اور ان کی وطن اصلی سے مہجوری صرف ضابطہ کی رہ گئی تھی، ظاہر و باطن کی یہ جامعیت خلفائے راشدین کے زمانہ تک برقرار رہی پھر اموی خلفاء نے شریعت کے صرف ظاہری قوانین کی تنفیذ کو اپنی ذمہ داری قرار دے کر تزکیۂ نفس اور صحبت کے ذریعہ روحِ اعمال کی منتقلی کے فریضہ سے دست بردار ہو گئے، اس دور کے آغاز سے ظاہر و باطن میں تفرقہ پڑ گیا، ظاہر شریعت کا نام فقہ اور باطن شریعت کا نام بعد کو تصوف پڑ گیا، اموی خلفاء کے اس حال کو دیکھ کر جن حضرات نے باطنی تربیت اور فیضانِ صحبت کا کام سنبھالا وہ پہلے "زہاد" پھر "عباد" پھر "صوفی" کہلائے اور حقیقت یہ ہے کہ پھر انہی کے ذریعہ امتیانِ محمدیؐ کو دنیائے دار الامتحان میں عملی کامیابی حاصل ہوتی رہی ان ہی نے فقر میں شاہی کی اور بادشاہتیں پاکر فقیرانہ طرز حیات کے نمونے پیش کئے، کامیاب زندگی جو عبارت ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامع ظاہر و باطن اسوۂ حسنہ کی پیروی سے، اس کی تحصیل کا طرز قطب ربانی محبوب صمدانی حضرت شیخ عبد القادر جیلانی قدس سرہٗ یہ تبلاتے ہیں:

کن مع اللہ عز وجل کان لا خلق	اللہ کے ساتھ اس طرح رہ، گویا مخلوق موجود ہی نہیں،
و مع الخلق کان لا نفس ، فاذا کنت	اور مخلوق کے ساتھ اس طرح رہ گویا نفس موجود ہی نہیں
مع اللہ عز وجل بلا خلق وجدتہ وعن	پس جب تو مخلوق کے بغیر اللہ کے ساتھ ہوگا تو اللہ کو پائے گا
الکل فنیت واذا کنت مع الخلق بلا نفس	اور سب سے فنا ہو جائے گا اور جب تو بلا نفس کے مخلوق

عدلت واتقیت وعن التبعات سلمت۔ (فتوح الغیب۔ مقالہ ۲۳)

کے ساتھ ہوگا تو تو عدل کرے گا اور حق پر قائم رہے گا اور برے انجام سے محفوظ رہے گا۔

اسم بامسمّٰی حضرت محی الدین الجیلی قدس سرہٗ نے جو بات ارشاد فرمائی، میں نے نقل کر دی اور آپ نے سن لی، مگر فرق یہ ہے کہ یہ عاجز یہ اطلاع پہونچا کر آپ کو اس حال کا صاحبِ حال نہیں بنا سکا جب کہ حضرت شیخؒ نے اپنی صحبت اور فیضانِ نظر سے اپنے مخاطبین کو اس مقام تک پہونچا کر "انسانِ کامل" بنا دیا تھا، آج بھی یہ درس حاصل کرنا ہو تو وہ کسی قائد سے نہیں، معقولی سے نہیں، نرے مولوی سے بھی نہیں، بلکہ کسی کامل المعرفت قوی نسبت صوفی صافی کی صحبتِ بابرکت سے حاصل کرنا ہوگا، اس کی صحبت سے قلب کو جلا ملے گی، اس میں نور آئے گا، اور پابندِ جسد روح پھر اس نورانی حاسہ سے "المستی" حقائق کو "کانک تراہ" پانے لگے گی، پھر یہی شخص ہوا و ہوس سے نکل کر صاحبِ عدل ہوگا، اور کوئی دنیوی تحریص اس کو "حق" سے ہٹا نہ سکے گی۔ یہی باکمال انسان ارضی خلافت کا فریضہ انجام دے سکے گا، دنیوی اقتدار اس کو منجانب اللہ ملے گا، کیونکہ اللہ پاک سے زیادہ وعدہ کا سچا کوئی نہیں، اور اس کا وعدہ ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ ۝ اس زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔ (الانبیاء۔ ۱۰۵)

اور جب اقتدارِ خلافت کی باگ ایسے "کامل انسان" کے ہاتھ میں آئے گی تو دنیا اس خلیفہ کے اندر پیغمبرانہ تجلیات کا پرتو کھلی آنکھوں سے دیکھے گی، جیسا کہ رازدانِ حقیقت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمایا:

الخلیفۃ من یمشی شریعۃ النبی فی الناس ویظہر علی یدہ موعود اللہ لنبیہ ظہرے دارد بطنے، ظہرش تمشیت است وبطنش داعیہ ایست قویہ کہ بواسطۂ پیغمبر در دل او متمکن شدہ، بلکہ از جذر دل او جوشد واگر ایں داعیہ در دل کسے نہ جوشد او را خلیفۂ خاص نمی تواں گفت۔[1]

خلیفہ وہ ہے جو نبی کی شریعت کو لوگوں میں جاری کرے اور اس کے ہاتھ پر خدا کے وہ وعدے جو اس کے نبی کے ساتھ تھے، پورے ہوں، اس کی ایک ظاہری صورت ہے اور ایک باطنی، ظاہری صورت احکامِ نبی کا نافذ کرنا ہے اور باطنی صورت وہ قوی داعیہ ہے جو بواسطۂ پیغمبر اس کے دل میں جاگزیں ہو، بلکہ دل کی گہرائی سے جوش زن ہوتا ہے، جس کے دل سے یہ داعیہ جوش زن نہ ہو، اس کو خلیفۂ خاص نہ کہیں گے۔

---

(۱) ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء۔ جلد اوّل۔ فصل سوم۔ ۳۵۰

یہ ہے اسلام کے روحانی نظام کی اجمالی اطلاع، جس کی جسارت راقم عاجز کو کرنی پڑی، ورنہ جو معلومات اوپر فراہم کی گئیں ان سے حقیقتِ حال کا اندازہ ہوگیا ہوگا کہ روحانی نظام قیل و قال کی چیز نہیں، بلکہ یہاں عارف رومیؒ جیسے دیدہ ور کی یہ تاکید ہے ؎

قال را بگذار مردِ حال شو ٭ پیشِ مردے کاملِ پامال شو

نظامِ روحانی سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ کسی مستند، صحبت یافتہ، صاحبِ مشاہدہ بزرگ کی صحبت اختیار کی جائے۔ حضرت علی متقی، صاحب کنز العمال بڑے محدث بھی ہیں اور ولی کامل بھی، وہ اپنے دریا بہ کوزہ رسالہ "تبیین الطرق الی اللہ" کو اس فقرہ پر ختم فرماتے ہیں:

"واما احتیاج الناس الی المرشد والاستاذ فلابد منه لتحصیل الطریق وسرعة الوصول واما سلوك الطریق بغیر المرشد والاستاذ فهو فی الجملہ ممکن ممن وفقه الله بموجب قولہ "والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا" بتعب شدید ومدة طویلة وهو نادر جداً۔"[1]	حصول طریقت اور سرعت وصول کے لئے کسی مرشد واستاذ کی حاجت ضروری ہے، کیونکہ گو فی الجملہ بغیر مرشد واستاذ کے بھی جس کو خدا توفیق دے، سلوک وطریقت میں کامیابی ہوسکتی ہے، جیساکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے" جو لوگ ہمارے لئے ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں، یقیناً ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت عطا فرماتے ہیں" مگر یہ بڑے مجاہدے اور مدت دراز کے بعد ہوتا ہے اور وہ بھی بہت ہی شاذ ونادر۔

ظاہر ہے کہ "نادر" کو کلیہ کی حیثیت نہیں دی جاسکتی، نہ کوئی عاقل قاعدۂ کلیہ کو چھوڑ کر مستثنیٰ کے درپے ہونا گوارا کرے گا، یہاں صحبت ازبس ضروری ہے، اور صحبت بھی ایسے کی جس کا سلسلۂ صحبت، صحبتِ نبویؐ تک متصل ہو۔ سب جانتے ہیں کہ سلسلۂ سند کا اہتمام یا تو محدثین میں ہے،

---

(۱) یہ رسالہ مخطوطہ شکل میں ہے۔ اس کی اولین اشاعت کی سعادت راقم الحروف کے حصہ میں آئی۔ پہلی مرتبہ یہ رسالہ "البعث الاسلامی" (لکھنؤ) بابت جولائی ۱۹۶۳ء (غالباً) میں چھپا، پھر اردو ترجمہ کے ساتھ اس کی دوبارہ اشاعت ماہنامہ بینات (کراچی)، بابت فروری ۱۹۶۴ء میں ہوئی، جب اسکی ادارت میرے ہاتھ میں تھی۔

یا پھر شیوخ طریقت میں اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ محدثینِ کرام کو یہ احتیاط ملحوظ ہے کہ اقوالِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) غیرنبی کے اقوال کی ملاوٹ سے پاک رہیں اور شیوخ طریقت کو یہ حزم دامنگیر ہے کہ صحبت نبویؐ کے فیوض، برکات اور انوار خود ساختہ مصلحین کی کدورتوں اور ظلمتوں سے پاک رہیں۔

اب رہا یہ اشکال کہ جب یہ علم صحیح علم ہے تو اس موضوع پر اکابر شیوخ کی اتنی کتابیں کیوں ملتی رہیں؟ اس کا صاف جواب یہ ہے کہ جن اکابر صوفیاء نے یہ کتابیں تصنیف فرمائیں وہ مدارس کے لیے تھیں، نہ عام مسلمانوں کے لئے' بلکہ وہ صرف طبقۂ سالکین کے لیے تھیں، تاکہ دورانِ مجاہدہ وسلوک انہیں جو اشکالات پیش آئیں ان میں انہیں رہبری حاصل رہے، یا جو احوال وعبقات یا مشاہدہ ومکاشفات حاصل ہوں ان کی حقیقت کو سمجھ کر تصدیق یا بصورتِ دیگر تصحیح کی سہولت حاصل رہے۔ ان کتابوں پر اور ان صوفیانہ اصطلاحات پر جو زمانہ بہ زمانہ وضع ہوئیں اور برتی گئیں اصل نظامِ روحانی کا جو نبی امیؐ، فداہ ابی امی کی صحبت بابرکت، فیضانِ نظر اور انفاسِ قدسیہ سے صحبت متواترہ کے ذریعہ ملا ہے قطعاً دارومدار نہیں، اسلئے محمد غزالیؒ ہوں، یا جلال رومیؒ، فخر رازیؒ ہوں، یا برکات احمد ٹونکیؒ ہر طالبِ تزکیہ وتصفیۂ باطن کو یہاں اولین انتباہ یہی ملتا ہے کہ ؎

صد کتاب وصد ورق در نار کن
سینہ را از نورِ حق گلزار کن

افسوس کہ عہد الست اور طریقت کے ناآشنا دانشور، ریسرچ اسکالرز، الٰہیات میں عقلی گھوڑے دوڑانے والے فلسفی اور تخیلات کے پتنگ اڑانے والے شاعر اور مستشرقین کے پیرؤوں کے ہاتھوں میں صوفیائے کرام کی یہ کتابیں پہونچکر عجیب مضحکہ خیز رائے زنی اور رد وقبول کا شکار ہو گئی ہیں، ان حرف زنوں کی نہ تصدیق معتبر، نہ تکذیب معتبر بلکہ آشنائے حقیقت یہ کہہ کر ان سے منہ موڑ لینے پر مجبور ہے کہ ؎

تو نہ دیدی گہے سلیماں را
چہ شناسی زبانِ مرغاں را

اللہ تعالیٰ ان "قد ضلوا واضلوا"[1] کے مصداق مدعیانِ افہام وتفہیم کے فتنہ سے اہلِ اسلام کو بچائے اور "السنی" حقائق کے متلاشیوں کو اس سے پہلے کہ ان کے ہاتھوں میں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ آئیں شیخ اکبرؒ کے سے کسی واقفِ اسرار کی صحبت میں پہونچائے، اس سے بیشتر کہ وہ مکتوبات سی صدی کو سمجھنے کی کوشش کریں شاہ شرف الدین یحییٰ منیریؒ کی سند صحبت رکھنے والے کی صحبت میں باریابی عطا کرے، اور اس کے بجائے کہ وہ مکتوبات امام ربانی اور معارف لدنیہ اپنی فہم نارسا سے دیکھیں انہیں مجدد الف ثانیؒ والے صاحبِ فیض کی توجہ کا مورد بنائے، اس کے بجائے کہ وہ فیوض الحرمین اور سطعات و ہمعات کو سمجھنے کی کوشش کریں، انہیں کسی وقت کے ولی اللہ کا فیضانِ نظر بخشے، اس سے پہلے کہ کوئی مولوی صاحب قرآن کے تصورِ تزکیۂ نفس، یا تصورِ تقویٰ پر قلم رانی کا تہیہ کریں، انہیں شاہ اشرف علی تھانویؒ جیسے صاحبِ نظر و خبر کی صحبت میں آکر نورِ نظر اور مشاہدۂ حقیقت حاصل کرنے کی توفیق بخشے، تاکہ ان کی خدمات سے ملّتِ اسلامیہ کو قرنِ اوّل والا نفع حاصل ہو۔

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ ھدیتنا وھب لنا

من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب

---

(۱) ترجمہ: "تحقیق کہ خود بھٹکے اور دوسروں کو گمراہ کیا"۔ یہ حدیث کے الفاظ ہیں، جو قیامت کے قریب پیدا ہونے والے بے بصر اہلِ علم اور ان کے خطرے سے بچانے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائے تھے۔

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدر آبادیؒ اور ان کی اصلاحی رباعیات

محمد رضوان القاسمی

زیر نظر مقالہ "عالمی رابطہ ادب اسلامی" کی ہندوستانی شاخ کے پانچویں "مذاکرہ علمی" میں ۹ اکتوبر ۱۹۸۹ء دوشنبہ کو پڑھا گیا، یہ مذاکرہ پریڈ ولا فنکشن ہال نز فتح میدان روڈ حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا جس کا عنوان "تحریک آزادی اور اصلاح عوام میں ادب اسلامی کا حصہ" تھا۔
(ادارہ)

قرآنِ حکیم، جو اسلامی ادب کا سب سے پہلا اور کامل نمونہ ہے، اس میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے: یؤتی الحکمة من یشاء ومن یؤت الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا (البقرہ - ۲۶۹) "وہ اللہ جسے چاہے حکمت عطا کرتا ہے اور جسے حکمت عطا ہو گئی، اسے یقیناً خیر کثیر عطا ہو گئی"۔ اسی کتابِ ہدایت میں ایک جگہ نبی مکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائضِ منصبی میں "حکمت کی تعلیم" کا تذکرہ کیا گیا ہے:

ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلو علیھم اٰیٰتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمة (الجمعہ - ۲) ——— ایک دوسری جگہ خدا کی طرف بلانے کے طریقوں کی نشان دہی کرتے ہوئے ایک طریقہ "حکمت" کا بھی بتایا گیا ہے: ادع الیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن (النحل - ۱۲۶)

آپؐ کا فرمان ہے: "حکمت اور دانائی کی بات مومن کی میراث اور اس کی گم شدہ پونجی ہے، جہاں اور جس جگہ اسے ملے، وہ اس کو حاصل کرنے کا سب سے زیادہ مستحق ہے"۔

یہ بھی واضح رہے کہ حکمت و معرفت کا تعلق زندگی کے کسی ایک شعبہ اور پہلو سے نہیں، بلکہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے، اور زندگی کے تمام ہی شعبے اس کے احاطہ میں آ گئے ہیں، اسی لئے شعبۂ شعر و ادب کو

پیشِ نظر رکھتے ہوئے اقبالؒ کے "دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل" محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات بجا طور پر ارشاد فرمائی: "ان من الشعر لحکمۃ" یعنی بعض اشعار حکیمانہ ہوتے ہیں۔

بڑے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی زندگی حکمت و معرفت سے معمور ہوتی ہے اور وہ اپنے اقوال، افعال اور اعمال میں حکیمانہ اور عارفانہ انداز و رجحان اختیار کرتے ہیں۔ دکن ہی نہیں، بلکہ دنیائے اردو کے مشہور رباعی گو شاعر "حکیم الشعراء" حضرت احمد حسین امجد علیہ الرحمۃ (۱۸۷۸ء—۱۹۶۱ء) ایسے ہی خوش نصیب لوگوں میں ہیں، جنہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں کو صحیح اور تعمیری رخ دیا اور اپنی رباعیات میں حکمت و معرفت کے بیش بہا مضامین اس خوبی، کمال اور سلیقہ کے ساتھ داخل کئے کہ ان کو پڑھنے والا بے ساختہ بول اٹھتا ہے:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا ؎ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حضرت امجدؔ کے تذکرہ کی ابتداء "حکمت" (جس کا ترجمہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے "تہہ کی بات" سے کیا ہے) سے اس لئے کی گئی کہ ان کی شعری زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز وصف "حکمت" ہی ہے، جس کا اظہار سخن شناس، نامور ادیب و صاحبِ قلم سید الملت مولانا سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء—۱۹۵۳ء) نے بھی کیا ہے، جس کا پس منظر یہ ہے کہ باوقار علمی و تصنیفی ادارہ "دار المصنفین" اعظم گڈھ کے ترجمان "معارف" میں جب حضرت امجدؔ کا کلام اکثر و بیشتر چھپتا رہا تو بحیثیت مدیر سید صاحبؒ کی نظر سے گذرتا رہا، سید صاحبؒ بتدریج ان کے کلام سے متاثر ہوتے رہے، یہاں تک کہ فروری ۱۹۳۲ء کے "معارف" کے اداریہ کے ذریعہ حضرت امجدؔ کے نام کے ساتھ "حکیم الشعراء" کے لقب کا اضافہ کرتے ہوئے سید صاحبؒ نے اس طرح اعترافِ کمال کیا کہ:

"معارف کا یہ شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطاب بانٹے، لیکن حضرت امجدؔ کے نو بہ نو حکمت آموز شاعری نے اس کو اعترافِ فضائل پر مجبور کیا، اور لفظ "حکیم الشعراء" سے واقعہ کا اظہار کیا گیا ہے۔"

سچ پوچھئے تو مولانا سید سلیمان ندوی ہی نہیں، بلکہ حضرت امجدؔ کے ہم عصر تمام بڑے شاعروں اور نقادوں نے ان کی شعری عظمت و رفعت، کلام کی تاثیری قوت اور بحیثیت انسان سوز و گداز، اخلاص و محبت، نیک نیتی، شفقت، شرافت، صداقت، سادگی، انکساری اور جذبۂ ہمدردی کو تسلیم کیا ہے، جن میں گرامی قدر علامہ اقبال، علامہ علی حیدر طباطبائی، مولانا عبد اللہ عمادی، پروفیسر حمید الدین سلیم، جوش ملیح آبادی

مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا عبد القدیر صدیقی حسرت، نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر سید محی الدین زور، مولانا عبد الماجد دریا بادی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندویؒ شامل ہیں ـــــ آخر الذکر نے اپنے ایک تعزیتی مضمون میں لکھا ہے:

"حضرت امجد حیدر آبادی تنہا شاعر ہی نہ تھے، بلکہ اس سے زیادہ حکیم و عارف اور صحیح معنوں میں اس دور کے سرمد اور ابو الخیر تھے، شاعری کو تو انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا، رباعی گوئی میں اس دور میں یگانہ تھے، اکبر اور اقبال کے بعد حکیمانہ شاعری انہیں کے دم سے زندہ تھی، ان کے بعد اس کا خاتمہ ہو گیا، اس لئے ان کی وفات تنہا دنیائے ادب و شاعری کا نہیں، بلکہ حقیقتاً دنیائے دل کا حادثہ ہے"

(یادگار امجد: مرتبہ پروفیسر اکبر الدین صدیقی، ص ۱۰۲)

مولانا اشرف علی تھانویؒ (۱۸۶۳ - ۱۹۴۳ء) کے بھائی حضرت محمد مظہر تھانویؒ امجد سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں سرمد (مشہور صوفی ایرانی شاعر پیدائش ۱۶۱۸ء وفات ۱۶۵۸ء) کہنے لگے تھے، اس سلسلے میں انہوں نے اپنا نذرانۂ عقیدت اس طرح پیش کیا ہے:

مداحِ رسولِ پاکؐ احمد ہیں آپ ؛ اور شاہِ رباعیات امجد ہیں آپ
توحید میں جمع ہو گئی ہے تثلیث ؛ حسان ہیں، خیام ہیں، سرمد ہیں آپ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور حضرت امجد کی شخصیت اور فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حضرت امجد کے کلام سے نہ صرف اردو شاعری فارسی کے ہم پلہ بن گئی ہے، بلکہ حیدر آباد کی عزت و آبرو میں ایک ایسا اضافہ ہوا جس پر یہاں کے رہنے بسنے والے ہمیشہ ناز کرتے رہیں گے، گذشتہ دو صدیوں میں وہی ایک ایسے منفرد شاعر دکن پیدا ہوئے تھے، جن کا احترام پوری اردو دنیا میں کیا گیا، اور جن کی ـــــ ہندوستان گیر شہرت ہمارے لئے سرمایۂ افتخار ثابت ہوئی"

(یادگار امجد ص ۸)

حضرت امجد کی زندگی کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پندرہ سولہ برس کی عمر میں انہوں نے شاعری شروع کر دی تھی ـــــ شاعری میں ابتداءً حبیب لکھنوی اور ترک علی شاہ ترکی سے اصلاح لی، پھر اپنی طبیعت ہی کو اپنا رہنما بنایا، ایک مدت تک غزل اور نظم کہتے رہے، اس کے بعد رباعیات کو اظہار خیال

کا ذریعہ بنالیا اور حقائقِ عالم، فلسفۂ حیات، اخلاقیات، اصلاحیات، خصوصاً مضامینِ تصوف کو رباعی کے پیرائے میں بیان کرتے رہے۔ یہ ایک اہم بات ہے کہ امجد کی شاعری کا اصل سرچشمہ قرآن و حدیث ہے یہ بھی علم میں رہے کہ ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۰۵ء میں شائع ہوا تھا، ابتداء کی زیادہ تر غزلیں اور کچھ رباعیاں ۱۹۰۸ء کی طغیانی رود موسیٰ کی نذر بھی ہوگئی تھیں۔

اس موقع پر اس کا اظہار بے جا نہیں ہوگا کہ رباعی کی خاص بحر ہے، اور اس کے خاص اوزان ہیں، اسی بحر اور انہیں اوزان میں رباعی کہی جاتی ہے، مثنوی اور غزل کی طرح "رباعی" کا نام بھی عربی سے نکلا ہے، جس کے لغوی معنیٰ چار چار کے ہیں، مگر یہ تینوں چیزیں سرزمینِ ایران سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں رباعی سب سے زیادہ مشکل چیز ہے، چار مصرعوں میں ایک مکمل مضمون اس انداز سے بیان کرنا کہ سامعین پر اس کا خاص اثر ہو، یقیناً ایک بڑا فن اور ہنر ہے، اس سلسلہ میں اصحابِ فن نے لکھا ہے کہ چوتھا مصرعہ خاص کر پہلے مصرعوں سے زیادہ شاندار اور اہم ہو، اسی مصرعہ پر شاعر کی تان ٹوٹتی ہے، یہ مصرعہ ایسا ہونا چاہئے کہ سننے والے کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہے۔

فارسی زبان میں بہت سے رباعی گو شعراء اپنا کمالِ فن دکھا چکے ہیں، سلطان ابوسعید، ابوالخیر، عمر خیام، سحابی نجفی اور سرمد سب سے زیادہ مشہور ہیں، جہاں تک تعلق اردو زبان کا ہے، تو اس میں رباعیات بہت سے شعراء نے لکھی ہیں، مگر "رباعی گو" کی حیثیت سے کوئی شاعر مشہور نہیں ہوا، انیس و دبیر اور شاد عظیم آبادی کی رباعیاں بلاشبہ دلچسپ ہیں، مگر امجد کی رباعیوں کو اردو دنیا میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، شاید اس مرتبہ تک کسی دوسرے شاعر کی رباعیاں نہیں پہونچ سکیں۔

بعض اہلِ فن کا خیال ہے کہ امجد کی رباعیوں میں وہی رنگ ہے جو سرمد کی رباعیوں میں، اس لئے اکثر لوگ انہیں ان کی زندگی میں "زندہ سرمد" کہا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پڑھنے کا انداز بھی عجیب مستانہ تھا، جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو خیالات بیان کر رہے ہیں، وہ ان کے دل کی آواز ہیں، سچ ہے، ع : یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ سے پہلے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کی نجی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالی جائے، کیونکہ اکثر اوقات میں اشعار، خیالات اور حالات کے پابند ہوتے ہیں اور دونوں کے درمیان گہرا معنوی ربط ہوتا ہے —— جب اس حیثیت سے حضرت امجد کی زندگی کا مطالعہ

کیا جائے گا تو معلوم ہوگا ــــــ کہ وہ اپنی ابتدائی زندگی میں جامعہ نظامیہ حیدرآباد کے طالب علم رہے، عربی کی درمیانی کتابوں تک یہاں تعلیم حاصل کی، حیدرآباد میں جس علم اور فن کے ماہران کی طالب علمی کے زمانہ میں مشہور تھے، ان سے بھی کافی علمی فوائد ان کو حاصل ہوئے بالخصوص بہار کے مشہور منطقی مولانا عبدالوہاب بہاری سے منطق کی متعدد کتابیں پڑھیں، سناد الملک آغا شوشتری کے حلقۂ درس میں شریک ہونے کیلئے روزانہ آٹھ میل پیدل چل کر اپنے فارسی ذوق کی تکمیل کی۔ اس زمانہ کی مشہور درس گاہ "دارالعلوم" سے منشی فاضل کا امتحان کامیاب کر کے فارغ التحصیل ہوئے ــــــ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں شیخ میراں صاحب کی دختر سے پہلی شادی ہوئی، جس سے ایک لڑکی اعظم النساء پیدا ہوئی، اس کے دو سال بعد کسی خانگی وجہ سے ماں سے بگڑ کر بنگلور چلے گئے، جہاں ایک معمولی ملازمت بھی اختیار کرلی۔ بنگلور میں تین چار ماہ گذار کر ماں کی وجہ سے پھر حیدرآباد آگئے اور اپنی مادر علمی "دارالعلوم" کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوگئے ــــــ ۱۹۰۸ء میں جب رودِ موسیٰ میں زبردست طغیانی آئی تو گھربار کے ساتھ ماں، بیوی، اور لڑکی موجوں کی نذر ہوگئیں، سارا کنبہ آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا، اس ناگہانی حادثہ اور عظیم المیہ سے متاثر ہو کر بحالتِ اضطراب امجد نے کہا تھا ؎

سیلاب میں جسم زار گویا خس تھا ؞ عرفات محیطِ غم کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجد ؞ عزت والے کو ایک چلو بس تھا

اس کے بعد وہ درگاہ خاموش صاحب کے سجادہ کے گھر رہنے لگے، پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ وہ مدرسۂ دارالعلوم کے صدر محاسبی کے دفتر میں منتقل ہوگئے۔ سیلاب رودِ موسیٰ کی تباہی کے کئی سال بعد مشہور عالم مولانا سید نادرالدینؒ کی عالمہ فاضلہ دختر جمال النساء بیگم (جنہیں امجد صاحب نے سلمیٰ کا لقب دیا) سے عقد ہوا، یہ عقد ان کے لئے نہایت موزوں اور روحانی ترقی کا ذریعہ ثابت ہوا ــــــ مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

"سچ پوچھئے تو شاعر امجد کو حکیم امجد بن جانے کا موقع شاعری کی تاریخ میں حکیم سنائی کے بعد جو ملا تو اس میں ان کی جبلی اور اکتسابی نکاتِ فائقہ کے ساتھ ساتھ بہت کچھ دخل مرحومہ سلمیٰ کی رفاقت کو بھی تھا۔" (یادگار امجد ص ۳۲)

حضرت امجد کی زندگی کے کئی سال جمال النساء بیگم سلمیٰ کے ساتھ ہنسی خوشی بسر ہوئے، دونوں

مل کر حج کے لئے گئے، واپسی حج کے کچھ عرصہ بعد بیوی کا انتقال ہو گیا، ان کے لئے انتقال کا یہ واقعہ موسیٰ ندی کے سیلاب ہی کی طرح اندوہناک اور پر الم ثابت ہوا، عرصہ تک امجد نہایت رنجیدہ رہے آخر دوستوں نے تیسری شادی کر دی، مگر امجد کی نفاست پسند طبیعت نے اس بیوی کے ساتھ زندگی بسر نا گوارا نہ کیا، ان کو روزِ اوّل ہی طلاق دیدی گئی اور ایک عرصہ کے بعد چوتھا عقد کیا، یہ بیوی آخر وقت تک ان کی شریکِ حیات رہیں ——— حضرت امجد کے شاگرد اور معتقد خاص جناب نصیر الدین ہاشمی نے ایک جگہ حضرت امجد کی اس نجی اور خانگی زندگی کو سامنے رکھتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ اگر ان کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین امور نہایت امتیازی طور پر نظر آتے ہیں:

" اولاً تنگ دستی اور غربت ہے، دوسری چیز غم و الم، یاس و حسرت ہے اور تیسری چیز تصوف ہے، جس سے درگاہ شاہ خاموش صاحب کے قیام کے زمانہ میں سجادہ سید شاہ صابر حسینیؒ کی صحبت اور رفیقۂ حیات جمال النساء سلمیٰ کی رفاقت نے اس موضوع پر ان سے مسلسل بات چیت اور تبادلۂ خیال کے سبب مناسبت، بلکہ گہری وابستگی پیدا ہو گئی تھی۔"

ہاشمی صاحب نے اس کے بعد لکھا ہے کہ:

" رباعیات کے شہنشاہ کی شاعری پر غور کیا جائے تو یہی تینوں امور ان کی شاعری میں نمایاں نظر آتے ہیں، اس کے سوا سب سے بڑا عنصر انسانیت کی آواز ہے جو امجد کے کلام میں صحیح طور پر سنائی دیتی ہے۔"

(یادگار امجد ص ۲۶-۲۵)

پروفیسر وحید الدین سلیم نے ایک جگہ حضرت امجد کی شاعرانہ خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

" امجد شعر گوئی کے وقت خیال کو پیش نظر رکھتے ہیں، یہ ان شاعروں میں نہیں ہیں، جو لفظوں اور محاوروں کے کھلونے تیار کرتے رہتے ہیں، ان کے کلام میں جا بجا وہی بجلی کوندتی نظر آتی ہے جو اہلِ بصیرت کے لئے ہوش ربا ہے، وہ شعر اسی وقت کہتے ہیں، جب کوئی خیال ان کو اپنے اظہار پر مجبور کرتا ہے، پھر وہ اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس خیال کو کس لباس میں ظاہر کریں، خود خیال ہی اپنے لئے لباس تیار کر لیتا ہے، اور اس کو پہن کر آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے، قدرتی شاعر کی یہی پہچان ہے، ان کی منتخب رباعیاں یقیناً زندہ رہیں گی اور اردو ادب کا اہم عنصر خیال کی جائیں گی۔" (افادات سلیم ص ۱۱۳)

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے مقصود یہ ہے کہ حضرت امجد کی شخصیت اور فن دونوں کا اجمالی اور عمومی تعارف کرا دیا جائے، جہاں تک تعلق ان کی رباعیات میں اصلاحی پہلو کی تلاش کا ہے، تو یہ واقعہ ہے کہ ان کی پوری شاعری اصلاحی اور تعمیری خطوط اور بنیادوں پر ہے۔ ان کا کوئی شعر اور کوئی رباعی ایسی نہیں، جس میں خفتہ ذہن و دماغ کو بیدار نہ کیا گیا ہو اور دل کی زمین نرم کر کے اس میں نصیحت کا بیج نہ بویا گیا ہو۔

ان کی تصانیف میں ریاض امجد، رباعیاتِ امجد، خرقۂ امجد، نذیرِ امجد، حجِ امجد، جمالِ امجد، حکایاتِ امجد، گلستانِ امجد، پیامِ امجد، حسنِ بلال، ایوبؑ کی کہانی اور میاں بیوی کی کہانی شامل ہیں۔ ان میں سے جس تصنیف کا مطالعہ کیا جائے ہر ایک میں عبرت و موعظت کے صدہا موتی اور اصلاح و تربیت کے سیکڑوں خاکے آپ کو ملیں گے، اس مختصر مضمون میں نمونے کے طور پر ہی ان کی بعض رباعیات پیش کی جا سکتی ہیں، تو آئیے! اس حصہ کا آغاز ان کی ان رباعیات سے کیا جائے، جن کا تعلق ان کی اپنی ذات سے ہے، اور تعارف اور "تحدیثِ نعمت" کے طور پر ان کی زبان سے یہ ادا ہوئی ہیں، فرماتے ہیں:

سید احمد حسین ہوں امجد ہوں ۔ حسان الہند ثانی سرمد ہوں
کیا پوچھتے ہو حسب نسب کو میرے ۔ میں بندۂ لم یلد ولم یولد ہوں

اسی طرح کی ایک دوسری رباعی ہے:

سید احمد حسین امجد ہوں میں ۔ امجد ہوں میں جوابِ سرمد ہوں میں
گوندھی ہوئی ہے نور سے مٹی میری ۔ خاکِ قدمِ پاک محمدؐ ہوں میں

ایک اور رباعی میں فرماتے ہیں:

ہر نقطہ و حرف کام کر جاتا ہے ۔ دامنِ گل معرفت سے بھر جاتا ہے
امجد کا کلام کوئی خنجر تو نہیں ۔ کیوں دل میں ہر ایک کے اتر جاتا ہے

امجد کا جو کلام پڑھے ان کے لئے ان کا یہ پیام ہے:

اک خستہ جگر کی روح کو شاد کرو ۔ ویرانۂ دل کو اس کے آباد کرو
امجد کے پیام کا یہی مقصد ہے ۔ امجد کو دعاء خیر سے یاد کرو

اس تعارفی رباعیات کے بعد بعض اصلاحی رباعیات ذیل میں پیش کی جاتی ہیں، جن میں زندگی کے مختلف پہلو مختلف انداز میں سامنے آئے ہیں، آج کا دور جو بظاہر الحاد و دہریت، بے دینی اور خدا بے زاری

کا ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر خدا کی عظمت و قدرت کا تذکرہ حضرت امجد اس طرح کرتے ہیں :

میری کوشش چل نہیں سکتی ۞ تیری مشیت ٹل نہیں سکتی
میرے بنائے کچھ نہیں بنتا ۞ لا الٰہ الا انت

غیر اللہ کے خاشاک کو جلانا اور ایک ہی اللہ سے اپنی تمام ضرورتوں، حاجتوں اور امیدوں کو وابستہ کرنا یہ مومن کی زندگی کی سب سے بڑی پہچان ہے، قرآن حکیم کی متعدد آیتوں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار ارشادات میں اس طرف توجہ دلائی گئی ہے ——— حضرت امجد اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں :

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو ۞ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو ۞ بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

ایک دوسری رباعی میں ارشاد فرماتے ہیں :

ہر دم اس کی عنایت تازہ ہے ۞ اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہے کھٹکھٹاتے جاؤ ۞ یہ دست دعا خدا کا دروازہ ہے

ایک اور رباعی ہے :

سنتا ہوں سب کی سنتا ہے وہ داستانِ غم ۞ کیونکر بلند نہ کروں میں دعا کو ہاتھ
مولا کے ساتھ ساتھ رہو تم جہاں رہو ۞ امجد کبھی ساتھ ساتھ ہے اپنے خدا کے ساتھ

ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص دنیا میں ساری دنیا پر غالب رہنا چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ خدا پر کامل بھروسہ رکھے، اس حقیقت کی تلقین وہ اپنی اس رباعی میں کرتے ہیں :

راز اپنا اگر خدا پر ہویدا ہو جائے ۞ انسان فرشتوں سے بھی اونچا ہو جائے
امجد وہ شخص کیا نہیں کر سکتا ۞ جس کو اللہ پر بھروسہ ہو جائے

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "اللہ، اللہ والوں کو دوست رکھتا ہے" حدیث میں بھی ارشاد ہوا ہے "جو شخص اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے" اب دیکھئے حضرت امجد کیا فرماتے ہیں :

کیا پھل ملتا ہے بیج بو کر دیکھو ۞ پانے کی اگر ہوس ہے، کھو کر دیکھو
کیا عرض کروں کہ اس میں کیا لذت ہے ۞ اک مرتبہ تم کسی کے ہو کر دیکھو

آج عام انسانوں، مسلمانوں اور خاص طور پر ان کی نئی نسلوں میں علمی اور تعلیمی شعور پیدا کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اس سلسلہ میں حضرت امجد نے لکھا ہے کہ:

"ایک روز ہمارے دروازے کے سامنے سے کمہاروں کے کندھوں پر پالکی میں کوئی امیر سوار جا رہے تھے، پالکی پکڑے ہوئے ایک آدمی بھی ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا، والدہ نے ہم کو بلا کر دکھایا اور کہا دیکھو اور اچھی طرح سمجھو! ایک آدمی سوار ہے، ایک پیدل پاؤں پالکی کے ساتھ دوڑ رہا ہے، بتاؤ ان دونوں میں سے تم کو کس کی زندگی پسند ہے، ہم نے کہا پالکی سوار کی، والدہ نے کہا کہ ایسی زندگی تو بغیر علم کے کسی کو نصیب نہیں ہو سکتی، اگر نہ پڑھو گے تو تم کو بھی اسی آدمی کی طرح پالکی کے ساتھ دوڑنا پڑے گا۔"

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں "وقت کی بات، گفتگو کا اثر، اس بیش بہا مثال سے ہم سہم گئے اور کھیلنے اور وقت ضائع کرنے سے توبہ کر کے پڑھنے لکھنے کا عہد کر لیا۔

دل پہ لگی جا کے ہتھوڑے کی طرح ۔ کہنے کو ظاہر میں وہ ایک بات تھی
کر دیا دم بھر میں ادھر سے اُدھر ۔ بات تھی یا کوئی کرامات تھی

یہ تو بات علم کی ہوئی، مگر سب جانتے ہیں کہ علم کے ساتھ عمل بھی ضروری ہے، ایک موقع پر مشہور بزرگ شیخ احمد رفاعیؒ نے اہلِ علم سے خطاب کرتے ہوئے نہایت عمدہ بات ارشاد فرمائی: "ایسا نہ ہو کہ تم علم کی چاشنی تو لے لو اور عمل کی تلخی کو چھوڑ دو۔" ــــــ اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر نافع علم سے خدا کی پناہ مانگی ہے۔ ایک صاحب دل بزرگ فرماتے ہیں کہ: "علم بڑا غیور ہے، وہ پہلے عمل کے دروازے پر دستک دیتا ہے، جب جواب نہیں ملتا ہے تو واپس چلا جاتا ہے۔"

حضرت امجد فرماتے ہیں۔

راہِ خدا سے ہٹ نہیں سکتا کبھی قدم ۔ انسان کے دماغ میں جب تک خلل نہ ہو
اس علم پر ہے علم کا اطلاق ہی غلط ۔ جس علم کا نتیجہٴ لازم عمل نہ ہو

حضرت امجد کے کلام سے اصلاحی باتوں اور پیغام کا انتخاب بڑی طوالت کا کام ہے، اس لئے اب مختصر عنوانات کے تحت ان کی رباعیات درج کی جاتی ہیں، اہلِ فکر و نظر تھوڑی سی توجہ سے حضرت امجد کے معنیٰ و مراد اور مفہوم و مطلب کو پالیں گے۔

عمدہ باتوں کا حصول

پھول کانٹوں کو ہٹا کر چن لو ⁂ خلشِ خار سے ڈرنا کیا ہے
کہنے والے کو نہ دیکھو کہ ہے کون ⁂ تم یہ دیکھو کہ وہ کہتا کیا ہے

تقدیر پر یقین

کھیتی میرے فلسفہ کی پکتی ہی نہیں ⁂ تدبیر سے تقدیر چمکتی ہی نہیں
کھاتی ہے ہمیشہ منہ کی لیکن پھر بھی ⁂ "یہ کیا" "وہ کیوں" سے عقل تھکتی ہی نہیں

صبر

کچھ وقت سے ایک بیج شجر ہوتا ہے ⁂ کچھ روز میں ایک قطرہ گہر ہوتا ہے
اے بندۂ ناصبور تیرا ہر کام ⁂ کچھ دیر میں ہوتا ہے مگر ہوتا ہے

بے صبر کی جان ہمیشہ گھبراتی ہے ⁂ تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے
آسان ہوتی ہے صبر سے ہر مشکل ⁂ ہر قفل میں یہ کلید ٹھیک آتی ہے

سختی اور آسانی

دل کی ہر اک خلش نکل جاتی ہے ⁂ آتی ہے اگر بلا تو ٹل جاتی ہے
سختی سے حوادث کے نہ گھبرا امجد ⁂ یہ برف کوئی دم میں پگھل جاتی ہے

ظلم کا انجام

اے قلب شکستہ کے ملنے والو ⁂ آروں کی طرح سروں پہ چلنے والو
پہلے تم اپنے پاؤں کی خیر مناؤ ⁂ اے شیشے کے ٹکڑوں کو کچلنے والو

وار اپنا پلٹ پڑا انھیں پر ⁂ رونا پڑا غیر کو ستا کر
جلتی رہی شمع عمر ساری ⁂ دم بھر پروانے کو جلا کر

بے محل ہنسی اور نکتہ چینی

اسی لغویت میں میں خود پھنس رہا ہوں ٭ مگر غیر کے فعل پر ہنس رہا ہوں
بھرا ہوں معائب میں خود سر سے پا تک ٭ پر آوازے ہر ایک پر کس رہا ہوں

خودی اور خدا

گمراہ ہوئے تو رہنما یاد آیا ٭ جب آ گئی پیری تو عصا یاد آیا
فرعون بھی وقتِ غرق لایا ایمان ٭ جب چل نہ سکی خودی خدا یاد آیا

حسد

موت آنے سے پہلے ہی مرا جاتا ہے ٭ گویا حاسد بھی صوفی صافی ہے
آتش میں حسد کے جلنے والوں کیلئے ٭ حکم مُوتُوا بِغَیظِکُم کافی ہے

خاکساری

ہر اک کو سرور آہ و زاری سے ملا ٭ اور آنکھوں کو نور اشکباری سے ملا
سجدے میں ہر ایک زمیں پر سر رکھتا ہے ٭ یہ رتبہ زمیں کو خاکساری سے ملا

سخت بات

کہو وہ بات جس میں ہو کرامات ٭ سخن ہی حاصلِ دنیا و دیں ہے
نہ کیجیے سخت بات امجد کسی سے ٭ زباں میں دیکھیے ہڈی نہیں ہے

گالی

ہیں ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ساری ٭ جس نے عالم کو غیر سمجھا چوکا
منہ اپنا کیا خراب گالی دے کر ٭ تم نے میلا چبا کر منہ پر تھوکا

اتحاد کا سبق

کعبہ میں نماز کا طریقہ دیکھا ٭ کثرت میں بھی توحید کا نقشہ دیکھا
ہر چند کہ مختلف ہے ہر ایک کی سمت ٭ لیکن ہر اک کو رو بقبلہ دیکھا

مساوات

مسلم ہو تو مسلم کو برادر سمجھو ✤ ہر ذرّے کو خورشید کا مظہر سمجھو
کیوں ہوتی ہیں مستوی صفیں وقتِ نماز ✤ یعنی ہر ایک کو تم برابر سمجھو

وحدت

اب آنکھوں میں بینائی کا جوہر آیا ✤ سب ایک ہیں آج مجھ کو باور آیا
دیکھو تو ذرا وجود کی وحدت کو ✤ وار اس پر کیا تھا زخم مجھ پر آیا

دوست

میں یہ نہیں کہتا کہ خدا پیدا کر ✤ دکھ سکھ کا شریک آشنا پیدا کر
جس سے نظر آئے تجھ کو اپنی صورت ✤ امجدؔ، ایک ایسا آئینہ پیدا کر

ازدواجی زندگی

دو دل ایک ہوں تو نخل پھلتا ہے ✤ دل گود میں حسن و عشق کے پلتا ہے
امجدؔ! بجلی کی روشنی کے مانند ✤ دو تار سے زیست کا دیا جلتا ہے

حقیقی تحفظ

جو چیز جہاں کی ہے رکھ چھوڑو ✤ کچھ کل کے لئے بھی ارمغاں رکھ چھوڑو
فانی ہاتھوں میں کیا رہے گا باقی ✤ اپنا سب کچھ خدا کے ہاں رکھ چھوڑو

زکوٰۃ

دیدیجئے خوش دلی سے ہر ایک کا حق ✤ برباد نہ کیجئے کھیت ایک جو کیلئے
ایک جزو زکوٰۃ ہے محافظ کل کا ✤ ہے ڈھائی روپے کا سنتری سَو کیلئے

غرور

جن ہے یا بھوت، یا کوئی دیوتا ہے ✤ اکسیر ہے، کیمیا ہے، یا عنقا ہے
اک عمر سے سن رہا ہوں "میں" کی آواز ✤ معلوم نہیں ہوا کہ "یہ میں" کیا ہے

ایضاً

ہے نام کے ساتھ ساتھ بدنامی بھی ⁂ ہے کام کے ہم رکاب ناکامی بھی
عرفان کا دعویٰ ہے جہالت کی دلیل ⁂ اظہار میں پختگی کے ہے خامی بھی

کوشش

فطرت کا تقاضا ہے کہ کوشش میں رہے ⁂ دلچسپیٔ عقل ہے کہ کاوش میں رہے
جب تودۂ خاک پھر رہا ہے دن رات ⁂ خاکی انسان کیوں نہ گردش میں رہے

ہزاروں بار دنیا میں بہار آئے مگر پھر بھی ⁂ ہمارا غنچۂ خاطر نہیں کھلتا نہیں کھلتا
ہزار اپنی طرف سے کوششیں کرتے رہو لیکن ⁂ مقدر سے زیادہ وقت سے پہلے نہیں ملتا

کامیابی

کچھ کئے جاؤ لے کے نامِ خدا ⁂ کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کچھ اور چیز نہیں ⁂ کام کرنا ہی کامیابی ہے

روانیٔ عمر

کیا وقت گزر رہا ہے نادانی میں ⁂ بیٹھے ہیں عالمِ فانی میں
جس عمر پہ ہے گھمنڈ اتنا ہم کو ⁂ ہے دھوپ میں برف یا نمک پانی میں

زندہ درگور

کل تک جو سلیمان تھے وہ مور ہیں آج ⁂ جو صاحبِ زور تھے وہ بے زور ہیں آج
مرتے تو ہوا کرتے ہیں درگور امجد ⁂ لیکن زندہ بھی زندہ درگور ہیں آج

فانی اور باقی

واجب ہی کو ہے دوام، باقی فانی ⁂ قیوم کو ہے قیام، باقی فانی
کہنے کو زمین و آسمان سب کچھ ہے ⁂ باقی ہے اسی کا نام، باقی فانی

اپنی بات پر یقین

اس خانۂ رنگی میں کوئی ہے کہ نہیں ٭ بات اپنی ہی اپنے دل نشیں ہے کہ نہیں
جس بات کا کرتے ہیں دعویٰ حضرت ٭ خود آپ کو بھی اس کا یقین ہے کہ نہیں

خدا کی مخلوق کے ساتھ برتاؤ

ہر شخص کے دل کو خوش رکھو عید ہے یہ ٭ ہر چیز کو اچھا کہو تحمید ہے یہ
مخلوقِ خدا ہے سب خدا کی مخلوق ٭ سب کو تم ایک سمجھو توحید ہے یہ

اپنا کام

خود اپنا وجود آپ پر بھاری ہے ٭ ہر کام میں نوکر کی مددگاری ہے
مشکل ہے امیر کو جگہ سے ہلنا ٭ دولت مندی بھی ایک بیماری ہے

مفت خوری

کام کرنے میں کوئی عیب نہیں ٭ کام کرنا بھی کوئی چوری ہے؟
اہلِ غیرت کی شرع و ملّت میں ٭ مفت خوری حرام خوری ہے

عزت و ذلت

یہ آبرو تمہاری چشمہ حیات کا ہے ٭ اس کو کرو نہ گندہ خواہش کی گندگی سے
ایک نان کے لئے کیوں دیتے ہو جان امجدؔ ٭ عزت کی موت اچھی ذلت کی زندگی سے

ذلت کی جگہ نہیں ہے آنا اچھا ٭ بے غیرت کا جہاں سے جانا اچھا
ملتا ہے جو کھانا گالیاں کھا کھا کر ٭ ایسے کھانے سے زہر کا کھانا اچھا

ھنر

دنیا کا مقولہ ہے کہ زر اچھا ہے ٭ ہم کہتے ہیں کہ زر سے تو ہنر اچھا ہے
وہ صاحبِ مال ہے تو یہ اہلِ کمال ٭ شاہ کشور سے پیشہ ور اچھا ہے

طمع و دولت کا اثر

براچھا، جواں بوڑھا، نظر ہی کچھ نہیں آتا ؛ روپے کی ٹھیکری میں کیا نقش عیب پوش ہے
فقط دولت کی خاطر کرتے ہیں اولاد کو قرباں ؛ کبھی دختر کشی تھی اور اب دختر فروشی ہے

مزاج کے فرق کا اثر

ایک موتی کھرل میں پستا ہے ؛ ایک سرتاج تاج ہوتا ہے
لے رہا ہے اثر مفید و مضر ؛ جس کا جیسا مزاج ہوتا ہے

پدرم سلطان بود

ابھی ہے نے باں پر پدرم سلطان بود ؛ فاقوں میں بھی شانِ کج کلاہی نہ گئی
اب پھرتے ہیں بن کے شاہ جی دنیا میں ؛ کیا خوب تباہی میں بھی شاہی نہ گئی

جھوٹے نام و نشاں سے خوش ہوتے ہیں ؛ مغرور شکوہ و شان سے خوش ہوتے ہیں
اجداد پر فخر کرتے ہو کیا امجد ؛ کتے ہیں جو استخواں سے خوش ہوتے ہیں

عبرت

ابھی خاک مجھ پر نہ ڈالو عزیزو ؛ امیدیں بہت قلب صد چاک میں ہیں
نہ نکلے کبھی ہم تو اس خاکداں سے ؛ کبھی خاک پر تھے کبھی خاک میں ہیں

بڑی دولت

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے ؛ آرام سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی ؛ دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

زوال

ہر شئی کے کمال کو زوال آتا ہے ؛ یہ دورِ فلک رنگ نیا لاتا ہے
خاکی ہستی کی سربلندی کب تک ؛ تنکا اڑ کر زمیں پہ گر جاتا ہے

حلال و حرام کی تمیز ___________

افیون ہو یا مٹھائی ہو منہ میں رکھ لی ؛ چیز اپنی ہو یا پرائی ہو منہ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اب بھی ؛ جو چیز ملی اٹھائی منہ میں رکھ لی

حرام لقمہ ___________

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں ؛ پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کماتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز ؛ کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

دو عملی ___________

دل میں کچھ ہے زبان پر کچھ ہے ؛ دیکھتے کچھ ہیں دھیان میں کچھ ہے
وزن کیا ایسی بات کا امجدؔ ؛ یاں ہے کچھ اور مکان میں کچھ ہے

تاثیر ___________

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے ؛ مضمون بلند لامکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبارِ فن خوب کہا ؛ لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے

حکیم الشعراء حضرت امجد حیدرآبادی کی رباعیات میں سے چند کا انتخاب اصلاحی نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے، حیدرآباد میں آج بھی ادبی محفلیں آباد ہیں اور متعدد ادبی انجمنیں اور ادارے سرگرم ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ فن شاعری میں امجد کے مذاق اور مزاج کو اپنایا جائے، قوم، ملت، ملک، سماج اور معاشرے کی اصلاح اسی طرح کے اشعار سے ممکن ہے، گل و بلبل اور شاہد و ساقی کے تذکرہ سے نفسانی خواہشات کو تسکین تو مل سکتی ہے، محفل اور مشاعرہ میں ایسے اشعار کے ذریعہ خوب دادِ تحسین بھی حاصل ہو سکتی ہے، مگر اس سے ذہن و فکر اور اخلاق و سیرت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔

بشیر النساء بیگم بشیرؔ نے اپنے بعض اشعار کے ذریعہ حضرت امجد کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے، وہ نہ صرف بہت خوب ہے، بلکہ حیدرآبادی اور مسلم شعراء کے لئے ایک درس اور پیغام ہے۔ ۵

ہے دکن کی سرزمیں کا نام ہیروں کی زمیں ؛ جس کی ہے تنویر کوہِ نور سے روشن جبیں
کیسے کیسے کوہِ نور ابھرے یہاں ہر دور میں ؛ نت نئے جوہر عیاں ہوتے رہے ہر دور میں

جوہرِ امجد بھی چمکا ہے دکن کی خاک سے ⁂ قلب پر جن کے اترتا ہے کلام افلاک سے
سرمدی ہے راگ جن کا جادو دانی ساز ہے ⁂ جن کے فیضانِ نوا میں زندگی کا راز ہے

شعرِ امجد در حقیقت مظہرِ الہام ہے
جس میں سوزِ درد ہے، تاثیر ہے پیغام ہے

بشیر النساء بیگم بشیر کی اس معنیٰ خیز اور حقیقت افروز نظم کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو موضوع کی مناسبت سے حضرت امجد ہی کی ایک رباعی پر ختم کیا جائے:

لو ختم ہوا آج کلامِ امجد ⁂ امجد کی جگہ رہ گیا نامِ امجد
اب آپ اس پر عمل کریں، نہ کریں ⁂ پہنچا دیا امجد نے پیامِ امجد

اعلان: دارالعلوم سبیل السلام میں ۱۰ ارشوال ۱۴۱۰ھ سے شعبہ عربی میں داخلہ شروع ہو جائے گا، لہٰذا جو طلبہ داخلہ کے خواہاں ہوں وہ ۱۰ ارتا ۱۵ ارشوال المکرم مدرسہ آجائیں اور اپنی سابقہ تعلیم گاہ کا تصدیق نامہ لانا نہ بھولیں۔ (ادارہ)

شعلۂ بیباک

عطا عابدی، افکار ملی، دہلی

لکھا ہوا قدرت کا مٹا ہے نہ مٹے گا
مومن کا قدم پیچھے ہٹا ہے نہ ہٹے گا
باطل کا فسوں حق پہ چلا ہے نہ چلے گا
اسلام کا پرچم نہ جھکا ہے نہ جھکے گا
پھونکوں سے یہ فانوس بجھا ہے نہ بجھے گا

مومن کی المناک کہانی پہ نہ جانا
اس قوم کی برباد جوانی پہ نہ جانا
کفّار کے دریا کی روانی پہ نہ جانا
ایمان کی خاموش زبانی پہ نہ جانا
یہ شعلۂ بیباک دبا ہے نہ دبے گا

سوچا ہے کبھی دہر میں آنے کا سبب کچھ
پھر کیا ہوا اگر حالِ زمانہ ہے عجب کچھ
کام آئے نہ آئیں گے کبھی نام و نسب کچھ
ہے عرصۂ ہستی میں عمل ہی سے تو سب کچھ
باتوں سے کوئی کام بنا ہے نہ بنے گا

الحاد کا بادل جو برستا ہے تو برسے
طوفان حوادث کا جو اٹھتا ہے تو اٹھے
نفرت کوئی اسلام سے رکھتا ہے تو رکھے
باطل جو صداقت سے الجھتا ہے تو الجھے
ذرّوں سے یہ خورشید چھپا ہے نہ چھپے گا

سلطان و شہنشاہِ جہاں ہو کہ بھکاری
جنگل ہو کہ دریا ہو وہ گلشن ہو کہ وادی
دنیا کی ہر اک چیز عطاؔ فانی ہے، فانی
جز ذاتِ خداوند کہ ہے دائم و باقی

دنیا میں سدا کوئی رہا ہے نہ رہے گا

○

سوال وجواب

مولانا زبیر احمد صاحب قاسمی
شیخ الحدیث دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

خیار بلوغ کا مسئلہ

"ایک اسلامی عدالت میں "خیار بلوغ" کے متعلق دائر شدہ مقدمہ کے سلسلے میں ایک سوال آیا، میں نے اس کا جو جواب دیا، اس پر دوسرا سوال نامہ پھر موصول ہوا۔ درج ذیل تفصیلی جواب ہے چونکہ ان سوالوں کی طرف واضح اشارہ ہو جاتا ہے، اس لئے بغرض اختصار اصل سوال کو حذف کر دیا گیا ہے۔"

الجواب:

آپ کے سابقہ خط میں دو مسئلے تھے، ایک "خیارِ بلوغ" سے متعلق اور دوسرا "خیارِ کفارت" کے بارے میں۔

پہلے مسئلہ کے متعلق میں نے لکھا کہ وہ مقدمہ جس میں ایک صغیرہ کا نکاح اس کا ولی جابر باپ، دادا کر دیتا ہے، اور لڑکی آج دو سال سے بالغہ ہے، مگر اس کا شوہر اب تک نابالغ ہی ہے اور آئندہ چار پانچ سالوں میں بھی اس کے بلوغ کی امید نہیں، اس نکاح کو "خیارِ بلوغ" کی دشوار گھاٹی میں لے جائے بغیر حقوقِ زوجیت کی عدم ادائیگی اور ابتلاء معصیت کے اندیشہ قوی کی بنیاد پر احیاءً للحق، دفعاً للحرج اور تحصیناً للعصمۃ فسخ کر دیا جائے، یہ طریقۂ فسخ اسلم واحوط ہونے کے علاوہ آسان اور مختصر رہے گا، بخلاف "خیارِ بلوغ" کی بنیاد پر فسخ نکاح کی راہ میں مختلف پیچیدگیوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے، اختلاف فقہاء اور پھر خیارِ بلوغ ملنے کے شرائط کے تحقق وعدم تحقق کا سوال بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ولی جابر کے کئے ہوئے نکاح میں بعد بلوغ صغیرہ کو حق فسخ ملنا یا نہ ملنا یہ الگ مختلف فیہ مسئلہ ہے اور اگر ولی جابر کے معروف بسوء الاختیار

ہونے کی بنیاد پر خیارِ فسخ دے بھی دیا جائے تو پھر کسی ولی جابر کے "معروف لسوء الاختیار" ہونے کی تعریف وتعیین میں الگ اختلافِ فقہاء کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس کے بعد اگر بعض محققین کی تحقیق وترجیح کے مطابق مقدمہ زیرِ بحث میں ولی جابر کو معروف لسوء الاختیار" تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ لڑکی نے مجلسِ بلوغ ہی میں اس نکاح سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا یا نہیں، کیونکہ بلوغ سے پہلے ردو انکار کا کوئی اعتبار نہیں، اور مجلسِ بلوغ میں اگر فوراً اظہارِ ناراضی نہ ہو، بلکہ خاموشی اختیار کرے تو پھر اکثر فقہاء "خیارِ بلوغ" کے حق کو ساقط قرار دیدیتے ہیں، خواہ یہ سکوت مسئلہ اور حقِ فسخ سے لاعلمی کی بنیاد ہی پر کیوں نہ ہو، کیونکہ آزاد لڑکیوں کے حق میں احکامِ شریعت کی ناواقفیت عذر نہیں قرار دیا جاتا ہے۔ اب اگر اس لڑکی نے اپنے بلوغ کی مجلس میں مسئلہ سے بے خبر ہونے کی بنیاد پر سکوت اختیار کر لیا ہو اور بعد میں لاکھ ردو انکار کرے تو عام فقہاء کی نظروں میں یہ مطلقاً قابلِ التفات نہیں اور اس کا حقِ فسخ بالبلوغ ختم ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ عام حالات میں اس نازک شرط کا تحقق نادراً ہی ہوا کرتا ہے، عورتیں اپنے "خیارِ بلوغ" کے حق سے استفادہ کی اس لازمی شرط سے عموماً ناواقف ہی ہوتی ہیں اور اس طرح اس حق سے استفادہ تقریباً عام عورتوں کے لئے ناممکن ہو جاتا ہے، ایسی صورتِ حال میں مقدمہ زیرِ بحث کے فیصلہ کی بہترین اور محتاط ترین راہ وہی ہو سکتی ہے، جسے میں نے لکھا تھا۔ "قضاء کے چند اہم مسائل" نامی رسالہ میں حضرت مولانا عبد الصمد صاحب رحمانی علیہ الرحمہ نے سوال نمبر ۳ کا جو جواب مختلف تفسیری اور فقہی روایات سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے، وہ بعینہٖ آپ کا مقدمہ زیرِ بحث ہی ہے۔ اس جواب کی آخری چند سطریں بلفظہٖ یہ ہیں:

> "بہر حال ایسی صورت میں کہ لڑکی بالغہ ہو چکی ہے اور شوہر کے بالغ ہونے میں ابھی دو چار برس کی دیر ہے اور لڑکی کا مطالبہ ہے کہ تاخیر و تاجیل میں اس کا ضرر ہے اور فتنہ میں مبتلا ہونے کا خطرہ ہے تو ظہار و ایلاء کے ضرر کی طرح اس ضرر کی بناء پر بھی قاضی کو نکاح فسخ کر دینا چاہیئے، خواہ یہ نکاح باپ دادا ہی کا کیا ہوا کیوں نہ ہو۔" ص۳۲

اگر وہ رسالہ آپ کے پاس ہو تو ایک بار اسے ضرور دیکھ لیں، اس میں قضار سے متعلق بہت سی نازک گتھیاں سلجھا دی گئی ہیں۔

بہر حال انہیں وجوہ کی بناء پر میں نے آپ کے سامنے وہ محتاط اور مختصر ترین طریقہ کار رکھا تھا مگر حیرت ہے کہ اول وہلہ میں تو آپ کو اس سے اتفاق ہو جاتا ہے، مگر بار بار کے غور و فکر سے جو بات آپ پر منکشف ہوتی ہے وہ آپ کو تذبذب میں ڈال دیتی ہے، حالانکہ جو بات غور و فکر کے بعد آپ پر منکشف ہوتی ہے وہ بجائے خود ایک مہمل اور بے معنیٰ بات ہے۔

آپ لکھتے ہیں: اس مقدمہ میں خیارِ بلوغ سبب فسخ ہے، اور دوسرا دعویٰ یعنی مدعیہ دو سال سے بالغہ ہے اور مدعا علیہ کے ابتدار بلوغ میں ۶، ۷ سال اور چاہیئے اس سے ابتلار معصیت کا اندیشہ ہے، یہ اندیشہ سبب فسخ نہیں"۔

آپ "خیارِ بلوغ" کو سبب فسخ کہتے ہیں، یہ کتنی مہمل اور بے معنیٰ بات ہے، آپ غور کریں، کہ "خیارِ بلوغ" کی اصطلاح تو در اصل ایک مختصر تعبیر ہے اور بدون تقدیر عبارت بے معنیٰ اصطلاح ہے اس اصطلاح کی اصل تقدیر یہ ہے "خیار الفسخ بالبلوغ" چنانچہ در مختار کی عبارت "لکن لهما خیار البلوغ" پر مصحح در مختار لکھتے ہیں: "فی نسخ الشرح التی بایدینا خیار الفسخ بالبلوغ"۔

اب آپ غور کریں کہ آپ کے قول "خیارِ بلوغ سبب فسخ" ہے، اس کی اصل تقدیر یوں نکلی: "خیار فسخ بالبلوغ سبب فسخ ہے"۔ بتلائیے اس کا کیا مطلب ہوا؟ جب کہ واقعہ یوں ہوتا ہے کہ شریعت خاص حالات میں صغیر و صغیرہ کو بلوغ کے بعد اپنے نکاح کو قاضی سے توڑوانے کا حق و اختیار دیتی ہے۔ اب اگر صغیرہ اپنے اس حق کے مطابق قاضی سے نکاح کے فسخ کرنے اور توڑ دینے کا مطالبہ کرتی ہے تو قاضی اس صغیرہ کے حق میں اس نکاح کے بقاء میں مضمر "ضرر و حرج" کی بنیاد پر نکاح فسخ کر دیتا ہے، فسخ کی اصل وجہ اور حقیقی بنیاد وہی ضرر و حرج ہی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ولی جابر "معروف بسوء الاختیار" ہوتا ہے، یا وہ ولی جابر نہیں، بلکہ ولی ابعد ہوتا ہے، تو سوء اختیار یا بعد قرابت کے سبب قصور شفقت کی بناء پر اس نکاح میں ممکن خلل ہو جاتا ہے، جو صغیر و صغیرہ کے حق میں باعثِ ضرر ہوتا ہے اور اس ضرر کو دفع کرنے کے لئے بلوغ کے بعد شریعت کی طرف سے اسے حق ملتا ہے کہ وہ قاضی شریعت کے ذریعہ اپنا نکاح فسخ کرا کے دفع ضرر کرے۔

زیر بحث مسئلہ کے تحت صرف صاحبِ ہدایہ کی تعلیل و توجیہ پر ہی آپ غور کریں تو بات واضح ہو جائے گی:

طرفین کے مسلک کی دلیل میں صاحبِ ہدایہ لکھتے ہیں:

لهما ان قرابة الاخ ناقصة والنقصان يشعر بقصور الشفقة فيتطرق الخلل الى المقاصد عسى، والتدارك ممكن بخيار الادراك۔ ص ۲۹۷، ج ۲۔

(باپ دادا کے مقابلہ میں) بھائی کی قرابت و رشتہ داری ناقص و کمتر ہوتی ہے، جو شفقت و خیر خواہی کے نقصان کی پہچان ہوا کرتی ہے، اسلئے بہت ممکن ہے کہ مقاصدِ نکاح میں خلل و ضرر کی راہ نکل آئے، جس کا تدارک خیار بلوغ ہی سے ممکن ہے۔

.. ..

پھر اس کے بعد "یشترط فیہ القضاء" کی توجیہ میں لکھتے ہیں: ——— "لان الفسخ هنا لدفع ضرر خفی وهو تمکن الخلل"۔

کیا ان توجیہات سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن صورتوں میں صغیر و صغیرہ کو "خیار فسخ بلوغ" کا حق ملتا ہے، وہ محض مقاصد نکاح میں امکان خلل اور ضررِ خفی کے ازالہ ہی کی بناء پر ملتا ہے؟ پھر آپ کا یہ کہنا کہ "اندیشۂ ضرر" سببِ فسخ نہیں، کیا معنیٰ رکھتا ہے۔

لڑکی بالغہ ہو چکی ہے، حقوقِ زوجیت سے محروم ہے، جذبات و احساسات کا خون ہو رہا ہے اور ابتلاءِ معصیت کا اندیشہ ہے اور آپ اسے شوہر کے بالغ ہونے تک کالمعلقہ رکھ کر نکاح فسخ بھی نہ کریں، کیا یہ طریقہ اس معصوم بے زبان کے حق میں ظلم و ضرر نہیں ہوگا؟

ہمارے خیال میں مذکورہ بالا توضیحات و اشارات کے بعد ہمارے بتلائے ہوئے طریقۂ کار ہی میں سلامتی و احتیاط ہے، اور مقدمہ ہٰذا میں فیصلہ کی راہ وہی بہتر قرار پا سکتی ہے، جو میں لکھ چکا ہوں، امید ہے کہ انشاء اللہ آپ کو بھی شرحِ صدر ہو جائے گا۔

ہمارا احساس یہ ہے کہ ہمارے پچھلے خط کے مندرجات پر آپ کی نظر محض سطحی پڑی ہے اور آپ اپنے دونوں سوالوں (خیارِ بلوغ، خیار کفاءت) کے دونوں جواب کے درمیان خطِ امتیاز نہیں کھینچ سکے ہیں، کیونکہ خیارِ بلوغ کے متعلق جو کچھ عرض کیا گیا تھا، اس سلسلے میں تو کوئی فقہی سندیں نہیں لکھی گئی تھیں، صرف قواعد کی روشنی میں ایک اسلم و احوط طریقۂ کار کی نشاندہی

کی گئی تھی، پھر پتہ نہیں آپ کن فقہی سندوں کے متعلق لکھتے ہیں کہ "اس کی جو فقہی سندیں لکھی گئی ہیں میرے ناقص خیال میں وہ قدرے قلیل اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہیں"۔

آپ میری تحریر ایک بار پھر پڑھیں، آپ دیکھیں گے کہ اس میں جتنی فقہی سندیں اور عربی عبارتیں ہیں سب کا تعلق صرف خیارِ کفاءت کے مسئلہ سے ہے، جس مسئلہ کو آپ نے اس حالیہ خط میں چھیڑا بھی نہیں ہے، جس سے بجا طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ کو کم از کم خیارِ کفاءت سے متعلق مسئلہ میں شرحِ صدر ہو چکا ہے، فللّٰہ الحمد۔

مقدمہ زیرِ بحث کی جو تفصیل آپ نے حالیہ خط میں لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لڑکی نے بحالتِ نابالغی بوقتِ نکاح اظہارِ ناراضی کیا اور ماموں کے گھر بھاگ گئی۔ اس سے تو کچھ حاصل نہیں ہوا، کیونکہ یہ نکاح باپ کر رہا ہے، جو ولی جابر ہے۔

اس کے بعد ایک سال پر لڑکی بالغ ہوتی ہے، تو پھر زبان سے کہتی ہے کہ یہ نکاح مجھے منظور نہیں، اگر اس نے یہ جملہ مجلسِ بلوغ ہی میں فوراً کہا ہوگا تو مفید ہو سکتا ہے، کیونکہ اشہاد بدرجہ ینبغی ہے، لیکن کیا دیہات کی ایک ناخواندہ لڑکی نے اپنے نازک حق کے نازک شرط کا اس قدر اہتمام واقعتاً کیا ہوگا؟

بقول آپ کے "لڑکی نے اوّل بلوغ ہی میں زبان سے انکار کر دیا" آپ اوّل بلوغ اور فورِ بلوغ کے باہمی نازک فرق کو مدنظر رکھ کر بتلائیں کہ کیا ایسا ہی ہوا ہوگا کہ جس مجلس میں لڑکی کو خونِ حیض کا پہلا جریان شروع ہوا، اس نے فوراً ہی اظہارِ ناراضی کر دیا ہوگا؟ اگر نہیں تو بتلائیے کہ فقہاء کی عام اور مشہور روایت کے مطابق خیارِ بلوغ کی بنیاد پر نکاح کے فسخ کرنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟ آخر میں آپ یہ لکھتے ہیں۔ "اب رہا یہ کہ میں نے خود نکاح فسخ نہیں کیا، بلکہ مجلسِ سماعت میں سماعت کے بعد لڑکی کو خیارِ بلوغ دیا اور اس نے اپنا نکاح خود فسخ کیا، اور میں نے اس کے فسخ کو قبول کر کے عدت گذارنے کا حکم دیا، یہ بھی میں نے عمداً کیا اور یہی اس مسئلہ میں قضاءِ قاضی ہے، حوالہ مستحضر نہیں، ملنے پر مطلع کروں گا"۔

یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، آپ کا حوالہ سامنے آئے تو کچھ عرض کیا جا سکتا ہے، ویسے اتنا میں آج کہہ سکتا ہوں کہ اولاً آپ یہ غور کریں کہ خیارِ بلوغ کسی قاضی کے دینے کی چیز نہیں،

شریعت کی طرف سے ہر صغیرہ کو مخصوص صورتِ حال میں ملا ہوا ایک حق ہے، جس کے تحت وہ شرعاً پابند ہے کہ اس حق سے استفادہ اسی وقت کر سکتی ہے، جب کہ اس کا استعمال مجلس بلوغ میں فوراً ہی کرے گی۔ آپ کے طریقۂ کار سے محسوس ہوتا ہے کہ اس لڑکی کو خیارِ بلوغ کا مسئلہ بھی معلوم نہیں تھا، تا بہ استعمال چہ رسد، اب آپ اسے خیارِ بلوغ دیتے ہیں، گویا اس کو ایک شرعی مسئلہ بتاتے ہیں، اور اس طرح وہ خیارِ بلوغ کے اپنے شرعی حق سے واقف ہو کر بلوغ کے دو سال بعد آپ کی عدالت میں سماعتِ مقدمہ کے دوران اپنے اس حق کا استعمال کرتی ہے، بتلائیے کہ اس سے اس کو کہاں تک فائدہ پہونچ سکتا ہے اور یہ طریقۂ کار کس طرح درست اور صحیح قرار پا سکتا ہے۔

باقی رہا جس صورت میں جمیع شرائط کے تحقق کے ساتھ خیارِ بلوغ سے استفادہ ممکن ہو اس میں استفادہ کی کیا صورت ہوگی، یہ الگ قابلِ غور اور بحث طلب مسئلہ ہے، میں نے یہ لکھا تھا کہ لڑکی کا اپنا نکاح خود فسخ کر دینے سے نکاح فسخ نہیں ہوگا، بلکہ قاضی شریعت کو فسخ کرنا ہوگا، اور دلیل کے طور پر میرے ذہن میں یہ فقہی عبارتیں تھیں:

۱۔ فی خیار البلوغ لا تقع الفرقة ولا یبطل النکاح ما لم یفسخ القاضی العقد بینهما۔ (قاضی خاں ص ۳۵۷ فصل فی الاولیاء)

خیارِ بلوغ والی صورت میں جب تک قاضی نکاح فسخ نہیں کرے گا، زوجین کے درمیان نہ فرقت واقع ہوگی، نہ نکاح باطل قرار پائے گا۔

۲۔ فان اختار الصغیر والصغیرة الفرقة بعد البلوغ فلم یفرق القاضی بینهما حتی مات احدهما توارثا ویحل للزوج ان یطأها ما لم یفرق القاضی بینهما۔ (عالمگیری ص ۲۵۵ ج ۱)

بلوغ کے بعد اگر صغیر یا صغیرہ نے فرقت کو پسند کر لیا لیکن قاضی کی طرف سے اب تک تفریق نہیں ہو سکی ہے کہ ان دونوں میں کوئی مر گیا تو ایک دوسرے کا وارث بن جائے گا، اسی طرح قاضی کی تفریق سے پہلے میاں بیوی کے تعلقات قائم کرنا بھی جائز رہے گا۔

۳۔ مولانا عبد الحی محشی ہدایہ "یشترط فیه القضاء" پر حاشیہ میں لکھتے ہیں:

لا یکفی قولها فسخت بل لا بد، ان یرفع النزاع الی القاضی حتی یحکم بانتهاء النکاح۔

صرف صغیرہ کا یہ کہنا کہ میں نے اپنا نکاح فسخ کر دیا کافی نہیں ہوگا، بلکہ اس مقدمہ کو قاضی کے پاس لے جانا ضروری ہے تاکہ قاضی نکاح کے ختم ہو جانے کا حکم لگائے۔

ان عبارتوں سے تو صراحتاً یہی معلوم ہوتا ہے کہ علی الاطلاق خواہ مجلسِ قضاء ہو یا مجلسِ قضاء سے باہر صرف صغیرہ کے "فسخت النکاح" کہہ دینے سے نکاح فسخ نہیں ہوتا، بلکہ ضرورت ہے قاضی کے فسخ نکاح، حکم بانتہاء النکاح اور انشاء فسخ کی۔

آپ کہتے ہیں کہ میں نے لڑکی کے فسخ کو قبول کر کے عدت گذارنے کا حکم دیا، جب لڑکی کے بذاتِ خود فسخ کرنے سے نکاح فسخ ہی نہیں ہوا تو آپ نے کس فسخ کو قبول کیا؟ فسخ معدوم کو؟ آپ کا فریضہ بحیثیت قاضی انشاء فسخ اور حکم بالفسخ تھا۔ کسی فسخ معدوم کو قبول کرنا نہیں، پھر بلا فسخ نکاح عدت گذارنے کا حکم فرمانے کا کیا موقع رہا؟

بہرحال یہ قابلِ غور امر ہے، آپ ذرا خالی الذہن ہو کر اپنے طریقۂ کار کے متعلق مزید سوچیں بلاشبہ بعض فقہی جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی فضولی نے کوئی فیصلہ کیا اور اس فیصلہ کو قاضی نے قبول کر کے اجازت دیدی تو صح القضاء، لیکن فضولی کا کیا ہوا فیصلہ اور حکم شرعاً موجود تو ہوتا ہے جس کی تقریر و تصویب من جانب قاضی ہو جاتی ہے اور قضاء صحیح ہو جاتا ہے اور یہاں آپ جس فسخ کی تقریر و تصویب بشکل قبول و اجازت کرتے ہیں اس کا شرعی وجود ہی نہیں ہوا۔

پھر اگر قضاء لغیرہ میں اجازت قاضی سے صحتِ قضاء کا تحقق ہو بھی جائے تو کیا یہی حکم قضاء لنفسہ میں بھی ہو گا، یہ الگ قابلِ غور امر ہے۔ یہاں لڑکی کے فسخ کی صحت کو مان بھی لیا جائے تو یہ قضاء لنفسہ کے قبیل کی چیز ہو گی جس کا قاضی کی محض تقریر و تصویب سے صحیح ہو جانا محل نظر ہی میں رہے گا۔

تاہم آپ لکھتے ہیں کہ: "یہ میں نے عمداً کیا ہے اور یہی اس مسئلہ میں قضاء قاضی ہے، یہ میرا تحقیق کیا ہوا اور دیکھا ہوا مسئلہ ہے، مگر اس وقت مستحضر نہیں کہ کہاں دیکھا ہے، تلاش میں ہوں، ملنے پر حوالہ سے مطلع کروں گا۔"

تو ضرور اس کی تلاش جاری رکھیں اور عبارت کا حوالہ دیں، تاکہ میں بھی اس صاف و صریح جزئیہ پر غور کر سکوں۔

لیکن اب تک میری رائے بہرحال یہی ہے کہ آپ زیر بحث مقدمہ میں عدم ادائے حقوقِ زوجیت اور ابتلائے معصیت کے خطرات کی بنیاد پر لڑکی سے فسخ نکاح کی درخواست

دلائیں اور چونکہ فریضۂ قضار میں احیار حق اور دفع ضرر داخل ہے، آپ تحقیق معاملہ کے بعد دفعا للضرر والحرج اور صونًا عن المعصیت نکاح فسخ کردیں اور انقضار عدت کے بعد نکاح ثانی کی اجازت دیں۔

"خیارِ بلوغ" ملنے کی بنیاد پر آپ نے جو طریقۂ کار اپنایا ہے وہ خالی از اشکال نہیں، فتأمل حق التامل۔

فقط۔ واللہ اعلم بالصواب

خبر نامہ

دار العلوم سبیل السلام

مولانا محمد یوسف مفتاحی

دینی تعلیم و تدریس کا اصل مقصود رضائے رب ہے، جو انسان کی ذاتی زندگی میں خشیتِ الٰہی اور فکر آخرت سے پیدا ہوتی ہے، موجودہ دور میں تبلیغ دین اپنی اصلاح کے لیے جوہر کی حیثیت رکھتا ہے دار العلوم سبیل السلام کو ابتداء سے ہی تعلیم کے ساتھ تبلیغ سے خصوصی مناسبت رہی ہے اور یہاں کے ارباب حل و عقد کو ہمیشہ سے گہری دلچسپی اور لگاؤ رہا ہے ——— چنانچہ مورخہ ۲۰ ربیع الآخر ۱۴۱۰ھ کو موقر علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ناظم مدرسہ مولانا محمد رضوان القاسمی مدظلہ نے مرکز نظام الدین اور مغربی یوپی کا تبلیغی دورہ کیا، کئی جگہ آپ کے خطابات بھی ہوئے، واپسی پر آپ نے طلبہ کے سامنے اپنے تاثرات اور تبلیغ کی افادیت پر مفید اور مختصر نصیحتیں فرمائیں۔

مورخہ ۲۳ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۰ھ کو صدر مدرس مدرسہ ہٰذا مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے ورنگل کا دورہ کیا، جہاں نوجوانوں نے سیرت النبی کے عنوان سے ایک اہم جلسہ منعقد کیا تھا، آپ کے علاوہ مشہور صاحب علم جناب عبدالرحیم قریشی صاحب اور مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامی بھی اس جلسہ میں شریک ہوئے، ۲ جمادی الثانی کو واپسی عمل میں آئی۔

دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کی شہر اور اضلاع میں ۱۵ شاخیں قائم ہیں، ایک شاخ شہر گنٹور میں بھی ہے، جس کے قیام کو ایک سال کا عرصہ ہوا ہے، چنانچہ صدر مدرس مدرسہ ہٰذا جناب مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی بذات خود مدرسہ کا معائنہ اور ششماہی امتحان کی غرض سے گنٹور تشریف لے گئے اور طلبہ کے امتحانات لئے، نتائج امتحانات امید افزا رہے، مولانا موصوف کا تاثر ہے کہ وہاں کے ذمہ دار مولانا ذاکر احمد صاحب رشادی کی ذاتی دلچسپی اور شہر گنٹور کے ذی علم اور باذوق علم دوست حضرات کی خصوصی توجہ سے مدرسہ کے تعلیمی معیار میں ترقی ہو رہی ہے۔

مجمع الفقہ الاسلامی دہلی کے زیر اہتمام منعقدہ دوسرے سمینار مورخہ ۸، ۹، ۱۰، ۱۱ دسمبر ۸۹ء

میں شرکت کے لئے مدرسہ ہٰذا سے مولانا محمد رضوان القاسمی، ناظم مدرسہ ہٰذا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صدر مدرس مدرسہ اور مولانا زبیر احمد قاسمی شیخ الحدیث مدرسہ ہٰذا دہلی تشریف لے گئے، جس میں بعض اہم جدید مسائل پر مباحثہ ہونا تھا، مثلاً "نوٹوں اور سکوں کی فقہی حیثیت"، "سودی قرض اور ہندوستان میں ربوا کا مسئلہ"۔۔۔۔ چنانچہ ان حضرات نے بھی اکیڈیمی کی جانب سے روانہ کردہ سوال نامہ کا جواب لکھ کر روانہ کیا تھا اور بذاتِ خود بحث میں حصہ بھی لیا۔ اس سمینار کی طے شدہ تجاویز بھی اس شمارہ میں شریک اشاعت ہے۔ چنانچہ جامعہ ہٰذا نے ہمیشہ ہی علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں حصہ لیا ہے اور اپنی حد تک برابر دست تعاون بڑھایا۔

مورخہ ۶، ۷ رجب ۱۴۱۰ھ کو مجلس علمیہ آندھرا پردیش کے زیر اہتمام سہ ماہی اجلاس اس مرتبہ ایف، سی، آئی کریم نگر میں منعقد ہوا تھا، جامعہ سے مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم مدرسہ ہٰذا کے علاوہ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، مولانا برکت اللہ قاسمی اور مولانا مفتی عبد الودود مظاہری صاحبان نے بھی شرکت فرمائی اور جلسوں سے خطاب بھی فرمایا، ۸ رجب کو واپسی ہوئی۔

مورخہ ۲۷ جمادی الآخر ۱۴۱۰ھ کو مولانا حکیم محمد عبد الوہاب ظہوری صاحب جامعہ ہٰذا کے معائنہ کیلئے تشریف لائے، یہاں کے تعلیمی و تربیتی نظام کو دیکھ کر موصوف نے اپنی مسرت کا اظہار فرمایا اور مفید مشورے دئے، موصوف نے یہاں کی علمی و تحقیقی سرگرمیوں کو دیکھ کر ۴۰، ۵۰ سال سے جمع کردہ قیمتی کتابوں کا ذخیرہ جامعہ ہٰذا کو وقف کر دیا جس میں تقریباً ۴۰۰ سو چھوٹی بڑی کتابیں ہیں اور بعض اہم مخطوطے، نیز بعض نہایت ہی قدیم قیمتی رسائل کی فائلیں ہیں، موصوف کا یہ اقدام باذوق اور اہلِ علم کے لئے قابلِ قدر اور نمونہ ہے، جزاکم اللہ خیر الجزاء، جامعہ کو ابھی مراجع اور اہم کتب کی شدید ضرورت ہے، جس کی طرف اہل علم کی توجہ مطلوب ہے۔

جناب ڈاکٹر عبد العلی صاحب برادر خورد نواب عبد الوہاب خاں صاحب مقیم ریاض سعودیہ عربیہ، جامعہ کی دعوت پر تشریف لائے، مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم مدرسہ نے جامعہ کے نظام تعلیم اور اپنے عزائم سے موصوف کو واقف کرایا اور موصوف نے یہاں کی درس گاہوں اور اسباق کے معائنہ کے بعد اپنی مسرت کا اظہار فرمایا۔

مورخہ ۱۳ جمادی الآخر ۱۴۱۰ھ کو حسامیہ منزل پنجہ شاہ حیدر آباد میں انجمن "یادِ فاضل" کے تحت

قراءۃ، تقریر اور مباحثہ کا انعامی مقابلہ منعقد ہوا، جامعہ ہٰذا سے بھی طلباء نے حصہ لیا اور الحمد للہ کہ چار طلباء نے کامیابی حاصل کی، قرأت میں حافظ انور حسین متعلم ششم عربی نے ترغیبی انعام حاصل کیا، تقریر کے مقابلہ میں دو طالب علم نے حصہ لیا جس میں حافظ مصلح الدین ششم عربی نے انعام اوّل پایا اور مباحثہ میں دو طالب علم خالد حسین صدیقی متعلم دورۂ حدیث اور مولوی اشرف علی متعلم شعبۂ تخصص فی الفقہ نے حصہ لیا اور بالترتیب دونوں نے پہلا اور تیسرا انعام حاصل کیا، جب کہ مقابلہ میں کل شرکاء کی تعداد ۱۰۰ سے متجاوز تھی، خوشی کی بات ہے کہ مدرسہ سے ۷ طالب علموں نے حصہ لیا اور چار انعام کے مستحق قرار دئے گئے۔

محترم الحاج سید ضیاء الرحمٰن صاحب صدر مجلسِ انتظامی نے باوجود علالت کے متعدد دعوتی، تبلیغی اسفار فرمائے اور گنٹور، محبوب نگر، ورنگل وغیرہ کے اہم سفر کئے، اس کے علاوہ سفر گنٹور کے موقع سے شاخ گنٹور کے استاذ مولانا ذاکر احمد رشادی اور مدرسہ کے ہمدردان و معاونین سے ملاقاتیں ہوئیں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف کو صحت و عافیت عطا فرمائے۔

معروف صاحبِ علم اور صاحبِ قلم مولانا غلام محمد صاحب، خلیفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ازراہِ نوازش "صفا" کے لئے ایک مضمون ارسال کیا ہے، جو اس شمارہ میں شریک اشاعت ہے مولانا موصوف نے اپنے خط میں "صفا" کی پذیرائی بھی فرمائی ہے، لکھتے ہیں:

"صفا" کے شمارے دیکھے، یہ سہ ماہی حسنِ ظاہری اور جمالِ معنوی کا مرقع ہے اور بڑے افادی مضامین اس کے ذریعہ شائع ہو رہے ہیں، خصوصاً نو پید امسائل مدن پر۔

حسب فرمائش اپنا ایک مضمون ملفوف ہے، پسند خاطر ہو تو "صفا" کے ذریعہ اس کو اہلِ "صفا" اور متلاشیانِ صفائے باطن کی ضیافت کا سامان بنائیے، ورنہ ؎

کہاں ان کی بزمِ طرب کے ہوں قابل
میں شوریدہ سر تلخ کامِ محبت"

آندھرا پردیش کی تبلیغی جماعت کے امیر محترم جناب نعیم اللہ خاں صاحب کا مدرسہ ہٰذا سے قدیم ربط ہے اور بارہا یہاں تشریف لاچکے ہیں، چنانچہ امسال بھی اساتذہ و طلبہ اور ذمہ داران کی خواہش تھی کہ آپ مدرسہ تشریف لائیں، تاکہ طلبہ کی تبلیغی و دعوتی سرگرمیوں میں مزید اضافہ ہو،

اور رمضان المبارک کی طویل فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دعوتی پروگرام مرتب کیا جائے، موصوف اسی غرض سے مدرسہ کی دعوت پر تشریف لائے اور طلبہ کے سامنے علماء کی ذمہ داری اور موجودہ دور میں فارغ ہونے والے طلبہ کے علاوہ کثیر تعداد میں طلبہ نے دعوتی اسفار میں نکلنے کا وعدہ کیا، توقع ہے کہ گنتور کے اجتماع میں طلبہ واساتذہ پر مشتمل ایک جماعت مدرسہ سے نکلے گی۔

مورخہ ۱۵ رجمادی الآخر کو جامع مسجد پیرہ گڈہ میں مدرسہ کی شاخ "مختصر مدتی عالم کورس" کا افتتاح ہوا، عوام کے اصرار پر اس شاخ کا قیام عمل میں آیا ہے، جو اس کے نظام تعلیم کی کامیاب اور مفید ہونے کی علامت ہے، ابھی مدرسہ کے استاذِ حدیث مولانا مفتی عبدالودود مظاہری روزانہ بعد نماز عشاء دو گھنٹے درس دیتے ہیں، اب تک چالیس طلباء نے داخلہ لیا ہے، جن میں عصری علوم حاصل کرنے والے طلبہ، تجارت پیشہ اور وہ حضرات شریک ہوئے ہیں، جن کے لئے مستقل طور پر علوم دینیہ کے حصول کے لئے وقت نکالنا مشکل ہے، مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب ناظم مدرسہ ہٰذا نے پہلا سبق پڑھا کر درس کا افتتاح کیا، اس موقع سے مقامی حضرات نے سیرت النبیؐ کے عنوان سے ایک جلسہ کا انعقاد بھی زیر صدارت مولانا برکت اللہ صاحب استاذِ حدیث مدرسہ ہٰذا کیا تھا، جس سے مدرسہ کے اساتذہ میں مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی صدر مدرس مدرسہ ہٰذا، مفتی عبدالودود صاحب، مولانا اکبرالدین صاحب قاسمی نائب ناظم مجلس علمیہ اور جناب منیرالدین صاحب قاری، نیز مولوی عبدالمنان صاحب صدیقی فاضل شعبہ ہٰذا نے خطاب فرمایا۔

مدرسہ میں تعلیمی سرگرمیوں کے علاوہ طلبہ کو تقریر و تحریر کی مشق کرائی جاتی ہے، مورخہ ۱۱ رجب ۱۴۱۰ھ کو انعامی مقابلہ کا اجلاس منعقد ہوا، اس مرتبہ گذشتہ دفعہ سے زیادہ طلبہ نے شرکت کی، تقریر میں ۳۰ طلبہ نے مقالہ و مباحثہ میں ۱۱ طلبہ اور بیت بازی میں ۱۰ طلبہ شریک ہوئے۔ جب کہ ایک طالب علم ایک ہی مقابلہ میں حصہ لے سکتا تھا، اس طرح تقریباً ۵۱ لڑکوں نے اس اہم مقابلہ میں حصہ لیا۔

تقریری مقابلہ گروپ (الف) میں حافظ محمد رحمت اللہ (ششم عربی) انعام اول محمد ابراہیم (دورۂ حدیث) کو انعام دوم اور محمد صلیح الدین (ششم عربی) کو انعام سوم کا مستحق قرار دیا گیا، نیز عبدالرحمن (ششم عربی) کو ترغیبی انعام دیا گیا۔

تقریری مقابلہ گروپ (ب) میں محمد عاقل (سوم عربی) کو انعام اوّل، احمد عبدالرؤف (سوم عربی) کو دوم اور محمد مسعود عالم (سوم عربی) کو سوم کا مستحق قرار دیا گیا اور وجاہت علی (چہارم عربی) کو ترغیبی انعام دیا گیا۔

مقالات و مباحثہ میں خالد حسین صدیقی (دورۂ حدیث) کو انعام اوّل، امتیاز احمد (ششم عربی) کو دوم اور شہاب الدین (پنجم عربی) کو سوم کا مستحق قرار دیا گیا، نیز نوشاد احمد (سوم عربی) اور انظر علی (ششم عربی) کو ترغیبی انعام دیا گیا۔

بیت بازی میں کل ۱۰ طلبہ شریک ہوئے، نصف گھنٹہ مقابلہ ہوتا رہا اور بغیر ہار جیت کے یہ مقابلہ جناب صدر کے حکم پر ختم کر دیا گیا۔ اوّل، دوم، سوم اور ترغیبی انعام بالترتیب ۱۰۰ روپے ۷۵ روپئے ۵۰ روپے اور ۳۰ روپے دئے گئے، بیت بازی میں شریک طلبہ کو بھی انعام دیا گیا، اس مقابلہ کے ممتحن میں مولانا زبیر احمد صاحب قاسمی شیخ الحدیث مدرسہ ہٰذا، مولانا برکت اللہ صاحب قاسمی استاذِ حدیث مدرسہ ہٰذا، اور مولانا سید اکبر الدین صاحب قاسمی، نائب ناظم مجلس علمیہ آندھرا پردیش تھے ناظم مدرسہ ہٰذا حضرت مولانا محمد رضوان القاسمی کی دعا پر مقابلہ اختتام کو پہونچا اور موصوف نے ہی اس کی صدارت فرمائی اور انعام کا اعلان کیا۔

اس وقت دار العلوم سبیل السلام کے تعمیری پروجیکٹ میں درس گاہ اور کتب خانہ کی تعمیر کا کام چل رہا ہے، محترم الحاج سید ضیاء الرحمن صاحب صدر مدرسہ کی نگرانی اور خاطر خواہ دلچسپی سے بحمد اللہ اچھا خاصا دونوں عمارتوں کا کام ہوا ہے، اسباب اور وسائل خاطر خواہ حاصل ہو گئے تو انشاء اللہ بہت جلد ان دونوں عمارتوں کی تکمیل ہو جائے گی اور اس کی وجہ سے مدرسہ کی تعلیمی و مطالعاتی نظام اور کام میں مزید بہتری اور استحکام پیدا ہونے کی توقع ہے، قارئین خصوصی طور پر دعا فرمائیں کہ اس اہم کام کی تکمیل ہو جائے، اور اس سلسلہ میں ممکنہ تعاون اور صدقۂ جاریہ کے حصول کی کوشش ضرور فرمائیں۔



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کے دار قدیم کا ایک منظر



دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد کی زیر تعمیر دو منزلہ درس گاہ کی عمارت کا ایک منظر

جس میں جملہ ۲۲ کمرے ہیں، ان کمروں میں ۲ بڑے ہال "دارالقرآن" اور "دارالحدیث" شامل ہیں

DARUL-ULOOM
SABEEL USSALAM
Sabeel Nagar, Balapur, Behind
Salalah, Barkas, Hyderabad-500 005 A.P. (India)

Phone : 239450